توحید الائمہ

توحید مفصل اور وجود باری تعالیٰ پر آئمہ طاہرین علیہم السلام
سے مروی احادیث کا جامع مجموعہ

تالیف
مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری مرحوم

ناشر
اسلامک بک سنٹر اسلام آباد
C-362، گلی 12، G-6/2 اسلام آباد
فون: 051-2602155

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.
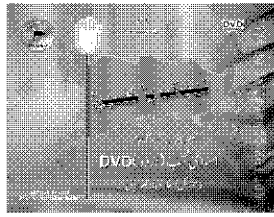
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

نام کتاب : توحید الآئمہ

مترجم : مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری مرحوم

نظر ثانی : خان زمان علوی

اشاعت اوّل : جون 2011ء

تعداد : 1100

کمپوزنگ : یونیورسل کمپوزنگ سسٹم، اسلام آباد

فون: 0301-5092509

ناشر : سید عمار رضا کاظمی، اسلامک بک سینٹر

C-362، گلی نمبر 12، سیکٹر G-6-2، اسلام آباد

فون: 051-2602155

قیمت : -/300 روپے

فہرست

تیسری نشست — ۱۳۹

ابتدائیہ

کتاب توحید الآئمہ ایک جامع اور علمی کتاب ہے جس میں توحید پروردگار کو آئمہ علیہم السلام کی روایات سے بیان کیا گیا ہے۔ بالخصوص امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد حضرت مفضل علیہ الرحمہ نے جو سوالات امام علیہ السلام سے کیے ان کے جامع جوابات اس کتاب میں درج ہیں۔

یہ کتاب دلائل وجود باری تعالیٰ پر ایک مدلل کتاب ہے یہ کتاب پاکستان میں پہلی بار ۱۹۸۵ء میں دارالاشاعت اسلامی پاکستان کی طرف سے شائع کی گئی۔ بعد میں مختلف احباب نے اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے توحید مفضل اور دلائل وجود باری پر علیحدہ علیحدہ حصوں میں شائع کیا۔ جس سے کتاب کی اہمیت کم ہوگئی۔

ہم نے احمد بک ڈپو کراچی سے اجازت لے کر اس کتاب کو معیاری طور پر اس کے اصل نام ''توحید الآئمہ'' سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم احمد بک ڈپو کے منتظمین کے بھی شکرگزار ہیں جنہوں نے فراغ دلی سے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی اور خصوصی طور پر حضرت مولانا ملک آفتاب حسین جوادی کے بھی جنہوں نے مولانا سید محمد ہارون زنگی پوری مرحوم کے حالات زندگی مختلف کتابوں سے حاصل کر کے ترتیب دیے ہیں۔

اسلامک بک سینٹر اسلام آباد پاکستان اپنی اعلیٰ کاغذ اور معیاری پرنٹنگ کے حوالے سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے اس وقت تک درج ذیل کتب منصۂ شہود پر آ چکی ہیں:

تزکیۂ نفس	سعادۃ الدارین فی مقتل الحسین علیہ السلام
مقتل لہوف	برزخ کا سفرنامہ
گنہگاروں کا بھیانک انجام	انسان عدالت الٰہیہ کے روبرو
اوّل وقت نماز	ہجرت و جہاد
حقوق اموات	ایلیاً آدم اور علیؑ
علیؑ اور تنہائی،	کشکول
نماز شیعہ	دعائے عرفہ امام حسینؑ ۔

اس کے علاوہ جن کتب پر مزید کام ہو رہا ہے ان میں اسرار حج آیت اللہ جوادی آملی، کتاب الزیارات مقامات مقدسہ، تنزیہہ الانبیاء و تنزیہہ الائمہ، قاتلانِ حسین کی گرفتاری و دیگر کئی کتب شامل ہیں۔ امید ہے قارئین اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ناشران اسلامک بک سینٹر اسلام آباد کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

اسلام آباد والسلام

۱۶ مئی ۲۰۱۱ء سید محمد ثقلین کاظمی

علامہ سید محمد ہارونؒ زنگی پوری کے حالاتِ زندگی

آپ ۲۴ ربیع الثانی ۱۲۹۳ھ بمطابق ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء کو بمقام زنگی پور ضلع غازی پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں اپنے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحسنؒ سے ابتدائی تعلیم اصول وعقائد اسلامی حاصل کی۔ ذہانت وفطانت اس قدر زیادہ تھی کہ آپ نے ۱۳ سال کی عمر میں فارسی ادب اور انشاء پردازی میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔ آپ نے ۱۴ برس کی عمر میں مولانا سید علی حسینؒ زنگی پوری اور مولانا سید محمد سمیعؒ زنگی پوری سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں آپ مزید حصول تعلیم کے لیے مدرسہ ایمانیہ بنارس تشریف لے گئے جہاں علام سید علی جواد رحمہ اللہ تعالیٰ سے شرح مسلم، ملا حسن، شرائع الاسلام اور مختصر المعانی وغیرہ کتب درساً پڑھیں۔ ۱۳۱۰ھ میں آپ باقاعدہ مدرسہ شارع الشرائع ناظمیہ، لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ مولانا مظفر علی خانؒ مرادآبادی اور علامہ نجم العلماءؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ادبیات میں مولانا سید مہدی مصطفیٰ آبادی سے درس لیا۔ ۱۹۰۱ء میں مدرسہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی اور مقتدر علماء کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی۔ مختلف مدارس دینیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے جب آپ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ اینگلو عربک ہائی اسکول، دہلی میں معلم اوّل، السنۂ شرقیہ مقرر ہوئے اور کم وبیش سات برس تک یہیں تعلیم دیتے رہے۔ دہلی ہی میں ۱۹۰۴ء میں آپ کو ایسا زہر دیا گیا جس کے اثرات آپ کے پورے جسم پر ہوئے۔ علالت بڑھنے پر آپ دہلی چھوڑ کر حسین آباد ضلع مونگیر میں قیام فرما ہوئے۔ وہاں بھی بیماری نے ساتھ نہ چھوڑا تو واپس وطن آ گئے۔ جب ۱۳۳۸ھ بمطابق ۱۹۱۹ء میں مدرسۃ الواعظین قائم ہوا تو آپ کو شعبہ تصنیف وتالیف کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہاں سے ہی ۱۹۲۰ء

میں آپ کی پہلی گرانقدر کتاب ''ابطال التناسخ'' شائع ہوئی۔

آپ بلاشبہ مناظر اور متکلم کی حیثیت سے لاثانی تھے چنانچہ آپ نے ۱۹۱۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں مختلف مکاتب فکر سے انتہائی کامیاب مناظرے کیے اور انہیں شکست فاش سے دوچار کیا۔ بالآخر ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو فاتحانہ شان سے واپس تشریف لائے۔

تصانیف

بے پناہ مصروفیات کے باوجود آپ کی تصانیف اور علمی تحقیقات موجود ہیں جن میں قرآنیات، احادیث نبویہ، فقہ اسلامی، کلام و مناظرہ، رجال، اوراد و اذکار اور علم ہیئت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں: توحید القرآن، علوم القرآن، ملخص التفاسیر (عربی)، القول الحصین شرح الاربعین (عربی) چھ جلدیں۔ سبحہ حسینیہ، تحفہ حائریہ، مسئلہ مسح علی القدمین، امامۃ القرآن، السیف الیمانی رد قادیانی، تنقیح البیان (رد فرقہ اہل قرآن)، ابطال التناسخ، شذرات العقیان، صنادید وطن، توحید الائمہ وغیرہ۔

وفات

زندگی بھر مکتب اہل بیتؑ کا دفاع اور دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہنے والے مسافر کی منزل بالآخر آ ہی گئی۔ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گئے صرف ۴۶ سال عمر کے گزرے تھے کہ آخر قضا و قدر کا حکم آ پہنچا اور ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ بمطابق ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

"توحیدُ الاَئمّہ"

کتاب کا مختصر تعارف

جسے عامۃ الناس کی تعلیم و ہدایت کے لیے مولانا الکامل مولوی فاضل و ممتاز الافاضل عالی جناب مولوی سید محمد ہارون صاحب زنگی پوری دام فیضہ نے باوجود تعلقات کثیرہ کے حقیقی خلفائے رسولؐ اور امناء اللہؑ کے کلام سے ترجمہ کیا ہے تاکہ دنیا کے تمام مذاہب، ہنود، آریہ، عیسائی، یہود، مجوس وغیرہم جو جو معرفت اللہ کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ دیکھیں کہ اصلی توحید اور حقیقی معرفت اللہ یہ ہے جو اِس کتاب میں مندرج ہے اور اِس سے حق و باطل کا تفرقہ معلوم کریں کہ ان حکمائے مذہب اور خلفاء حقیقہ سے بڑھ کر کسی کو معرفت اللہ حاصل نہ تھی اور یہ کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی اقتدا باعثِ نجات ہے۔

جناب پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی:

پیش لفظ

بعض تصانیف اپنی تمام ترافادیت کے باوجود ایک خاص ماحول اور وقت کے اعتبار سے گراں بہا ہوتے ہوئے گردشِ ماہ و سال اور مسائل نو کے سبب اپنی اہمیت مسلسل برقرار نہیں رکھ سکی ہیں۔ لیکن ''توحید الائمہ'' جو پیش قارئین ہے اس اعتبار سے نہایت وقیع و رفیع ہے۔ اس کتاب میں فلسفیانہ اور سائنسی استدلال اس نہج سے پایا جاتا ہے کہ یہ تصنیف دورِ حاضر کے متنوع تقاضوں پر محیط نظر آتی ہے۔ اس کا سبب قطعی طور پر یہی ہے کہ اس کتاب کے تمام مشمولات ان ذواتِ مقدسہ کے ارشادات و افکار کے تراجم ہیں جو اکتسابی علوم سے ماوریٰ ہیں۔

سرکار ختمی مرتبت علیہ التحیۃ والثناء کے روحانی جانشینوں کے ارشادات کا یہ ترجمہ مولانا محمد ہارون قبلہ اعلی اللہ مقامہ، فاضل علوم مشرقیات ''صدر الافاضل و ممتاز الافاضل'' نے ایک زمانہ ہوا کیا تھا اور یہ ترجمہ بے نظیر زیور طبع سے بھی آراستہ ہوا۔

ایسی بے بہا اور ایمان افروز کتاب کی اشاعت آج بھی اقتضائے وقت کے تحت نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً معقولات کا نمایاں پہلو نئی نسل کے اذہان سے ازحد تطابق رکھتا ہے۔ اس سائنسی دور میں اس کتاب کی اشاعت کو ایک اہم ضرورت کی تکمیل سے تعبیر کرنا حقیقت امر کا اظہار ہے۔

الوہیت سے متعلق جو نظریات پیش کیے گئے اور دلائل و براہین سے جو استنتاج کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

انسان کی طبعی ساخت اور اس کی سائنسی توجیہات سے یہ کتاب ایک ارمغان بے بہا ہے۔

مجھے امید واثق ہے کہ رُجحانات عہد حاضر کے سبب یہ کتاب انتہائی درجہ مقبول رہے گی۔

گفتار

تمام تعریفوں کا سرچشمہ اور سزاوار حمد و ثناء وہی ذات واجب ہے کہ جس نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیاءؑ کا سلسلہ قائم کر کے جناب ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٗ وسلم پر اس کا اختتام فرمایا اور حضورؐ جناب سرورِ کائناتؐ کے بعد آپؐ کی شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری آپؐ کے بارہ اوصیاءؑ اول ان میں حضرت علی علیہ السلام اور آخر قائم آلِ محمدؑ حضرت صاحب العصر والزمانؑ ہیں، کو سونپ دی جو قیامت تک محافظ شریعت رہیں گے۔

مالک حقیقی و پروردگار عالمین کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ جناب سرور کائناتؐ کی شریعت کو آپؐ کی امت کے لیے شریعت سہلہ اور آپؐ کی امت کو امت مرحومہ قرار دے کر ہم گناہگاروں کی دنیا و آخرت درست فرما دی جبکہ دیگر انبیاءؑ و مرسلینؑ کی امتوں کو یہ سہولتیں میسر نہ آسکیں۔ ساتھ ہی قرآن مجید جیسی جامع کتاب نازل فرمائی جو ہر لحاظ سے مکمل و مدلل اور معجزہ ہے۔ اگر ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو معجز نمائی و سخن رانی میں فصاحت اپنے حدکمال پر نظر آئے اور فصحائے عرب یہ کہتے ہوئے نظر آئیں کہ: ماھذا کلام البشر یعنی یہ کلام کسی بشر کا نہیں ہوسکتا۔ اور اردو زبان میں یہ مصرع دہرایا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

ادب کیوں کہ ہر زمانہ میں جدت پذیر رہا ہے۔ اور ہر نئی نسل اپنے زمانہ میں اپنے ماحول و مزاج کے مطابق اپنے رہن سہن اور طور طریقوں کی تجدید کرتی رہی ہے۔ اسی اعتبار سے ادبی دنیا میں بھی تبدیلیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ عربی زبان ہو یا

فارسی، انگریزی ہو یا جاپانی، تقریباً ہر زبان میں کوئی نہ کوئی جدت ضرور رونما ہوتی رہی۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو قدیم عربی رہی، نہ قدیم فارسی رہی، نہ کوئی دوسری زبان ہی اپنی قدیمیت پر باقی رہ سکی۔

اسی لحاظ سے اردو ادب بھی ہر زمانے میں جدت پسند رہا ہے۔ کیونکہ اردو زبان ایک ایسی وسیع زبان ہے کہ جس میں ہر زبان کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت موجود ہے اور اس کی آغوش ہمیشہ وا رہی ہے۔ اس زبان نے دوسری زبانوں کا صرف استقبال اور عزت افزائی ہی نہیں کی بلکہ ان کو ایک مقام عطا کیا اور اپنی آغوش کی حرارت سے پروان چڑھایا ہے۔

آمدم بر سر مقصد، کتاب ہذا ''توحید الائمہ'' میں اب سے پچاس برس قبل کے الفاظ و محاورے استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے زمانۂ ادب کے لحاظ سے تو نہایت موزوں ہیں لیکن عہد حاضر کے ادبی اعتبار سے مناسب نہیں ہیں۔

لہٰذا موجودہ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے الفاظ و محاورات میں چیدہ چیدہ تبدیلیاں ناشر کی اجازت سے کر دی گئی ہیں۔ تاہم اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ مفہوم مؤلف برقرار رہے جو کتاب کی جان و روح ہے۔

آخر میں قارئین کرام کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ وہ مؤلف و مترجم کتاب ہذا کی روح کو ثواب پہنچانے اور خود بھی مثاب ہونے کی غرض سے ایک بار سورۂ حمد اور تین بار سورۂ توحید درود شریف کے ساتھ پڑھ کر ثواب بخش دیں۔

والسلام

احقر جعفر زیدی

مُقدّمہ

از مولوی سید محمد ہارونؒ زنگی پوری

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لِلّٰہ اقراراً بنعمتہٖ و استسلاماً بعزتہٖ والصّلٰوۃ علٰی نبیّہٖ و حبیبہٖ محمّدٍ خیر بریتہٖ و عجیب صنعتہٖ و غریب قدرتہٖ و علٰی اھلبیتہٖ و عترتہٖ سیما علٰی اخیہٖ و صفوتہٖ و حامل شریعتہٖ و امین ملّتہٖ صلٰوۃ و سلاماً متصلا متواتراً لا انقطاع لمدتہٖ ولا احصاء لِعدَّتہٖ.

اما بعد۔ اہل عقول پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ عمدہ علوم و معارف معرفت پروردگار عالم ہے، کیونکہ انسان کو صرف دو عالموں سے تعلق ہے۔ ایک عالم دنیا، دوسرا عالم آخرت۔ دنیا میں رہ کر تو ان چیزوں کی معرفت بضرورت زندگی لازم ہوتی ہے جن پر بقائے حیات و بقائے تمدن ہے۔ لیکن چونکہ یہ عالم زندگی یقینی فانی ہے لہٰذا اُس جہان کی فکر مقدم ہے۔ اس لیے ہمیں اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کیا ہیں، کون ہیں، ہمارے گردوپیش کیا کیا چیزیں ہیں۔ وہ کیوں کر ہیں، کیوں ہوئیں، کس نے بنائیں، ہمیں کس نے بنایا، وہ کیسا ہے، وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، وہ کس عظمت کا ہے، کس طاقت کا ہے، کس صفت کا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر ہم اس سے بالکل غافل رہیں اس کی معرفت حاصل نہ کریں، اس کی عبادت نہ کریں تو ہمیں اس دوسرے عالم میں جانے کے بعد سخت سزا دے، تکلیف میں ڈالے، ہم پر عذاب کرے اور ہماری غفلت کا سبب ہم سے دریافت کرے تو اس وقت ہم کچھ جواب نہ دے سکیں۔ اس لیے ہمیں نہایت ضروری ہوا کہ واقعی حالت اس کی معلوم کریں۔ اور جہاں تک ہو

سکےاس کی مرضی کے مطابق کام کریں۔

یہاں تک تو شاید ہر قوم و ہر ملت کے افراد مانتے ہیں کہ ہم فانی ہیں ہم قائل سزا و جزا بھی ہیں، ہم سے بالاتر کوئی ہمارا مدبر و مصلح بھی ہے۔ البتہ وہ لوگ جو بالکل سائنس کے بندے ہیں ان کو اس میں تامل ہے کہ آیا، ہمارا کوئی پیدا کرنے والا ہے یا نہیں۔ مگر جس وقت وہ بھی باقاعدہ عقل سے غور کرتے ہیں تو ان کو بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اس عالم کا اور ہمارا خالق ہے جو بڑا حکیم، مدبر، عالم، قادر، عظیم وجلیل ہے۔

ذ ائی مذہب دنیا میں جتنے آئے ان سب کا یک زبان یہی قول رہا کہ کوئی اس جہان کا پیدا کرنے والا ضرور ہے۔ خواہ ہندو طریق پر انہوں نے دعوت کی ہو، عیسائی طریق، یا مجوسی طریق پر یا اسلامی طریق پر!! مگر طریقے مختلف تھے۔

مجوس، پارسی جو بہت قدیمی مذہب ہے ان کا تو خیال یہ رہا کہ خالق دو ہیں۔ ایک نور، ایک ظلمت۔ نیکی کا خالق نور ہے۔ بدی کا خالق ظلمت ہے۔ نور کا نام یزدان رکھا اور ظلمت کا نام اہرمن۔ مگر نور کو زیادہ طاقتور مانتے رہے۔ اسی لیے آتش پرستی اختیار کر لی۔ اب وہ آگ ہی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ ہنود اگر چہ دعویٰ توحید کرتے ہیں اور زبانی طور پر خالق عالم کو واحد مانتے ہیں مگر عملاً اس کے برخلاف ہیں۔ پتھر کی مورتیں اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ مٹی کے جانور بنا بنا کر ان کو سجدہ کرتے ہیں جو بالکل شان موحد کے خلاف ہے۔

عیسائی، مذہب کا داعی اگر چہ بڑا سچا، بڑا پاکباز، بڑا برگزیدہ، بڑا عارف، بڑا عابد تھا، اس نے توحید تو ضرور سکھائی، مگر اس کے ماننے والے اس کے اصلی مقصود کو یا تو سمجھے نہیں یا شدت محبت کی وجہ سے غلو کرنے لگے اور حضرت عیسیٰؑ اور روح القدس کو خالق عالم کا شریک بنا دیا، اور تثلیث کے قائل ہو گئے، اس لیے یہ بھی موحد نہ رہے۔

یہود، زمانہ سابق کے تو بالکل خدا کو سمجھ ہی نہ سکے اس کے لیے بیٹا تجویز کر دیا تھا۔ وہ حضرت عُزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا جانتے تھے۔ مگر اب کا حال معلوم نہیں ان لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ تاہم ایسے ہیں کہ ہندو، عیسائی، اہل اسلام اور مجوس سے ان کی رائے الگ ہے۔

اہل اسلام کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم موحد ہیں۔ چنانچہ ان کا قرآن جسے یہ لوگ کتاب خدا کہتے ہیں وہ بھی توحید ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o مگر اس فرقے میں بہت سے فرقے ہو گئے اور ہر ایک نے توحید میں ایک جداگانہ رائے اختیار کر لی۔ چنانچہ کچھ لوگ خدا کے جسم ہونے کے قائل ہو گئے۔ کوئی اس کے لیے مکان تجویز کرنے لگا، کوئی اس میں حوادث تجویز کرنے لگا، کوئی اس کے دیدار کا مشتاق بنا، کوئی اس کی صورت کا شیدا ہو گیا، کوئی اس کو خواب میں دیکھنے لگا اور کوئی جاگتے میں۔ غرض ان لوگوں نے اگرچہ دو خدا لفظاً نہیں مانے مگر واقعاً بڑا حصہ مسلمانوں کا صرف نام کا موحد رہا۔ باقی سب علامات و اقوال مشرکین کے سے اختیار کر لیے۔ اگر آپ میرے اس دعوے کی تصدیق چاہتے ہیں تو میرے اس آئندہ بیان کو پڑھیے۔ آپ کو ہر مذہب کا حال توحید کے متعلق معلوم ہو جائے گا اور اہل مذاہب کے خیالات کا اندازہ ہو سکے گا۔ اس کے بعد دیکھئے گا کہ عقل کیا کہتی ہے اور خالق کو کیسا ماننا چاہیے۔

میں مذاہب کے حالات اسی بنا پر لکھوں گا جو ان مذاہب والوں کی کتابوں میں مندرج ہیں یا ملل ونحل شہرستانی میں مذکور ہیں اس کی واقعیت اور سچائی کی ذمہ دار وہ کتابیں ہیں جن سے یہ باتیں اخذ کی جائیں گی[1]۔

[1] اس بیان سے میرا مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی مذہب پر ناجائز حملہ کروں یا بلاوجہ اس پر نکتہ چینی کو کام میں لاؤں بلکہ صرف واقعی حالت کا دکھانا مطلوب ہے جس سے صحیح اور غلط رائے کا تفرقہ معلوم ہو سکے۔ اگر ان اہل مذاہب میں سے کوئی صاحب ملت میرے بیان میں غلطی پائے اور انہیں اپنے مذہب کی خوبی بدلائل عقلیہ اسلام کے اصول سے بہتر ثابت ہو چکی ہو تو ان کو اعلان دیا جاتا ہے کہ اسلام کی توحید سے وہ اپنی توحید کو عقلی دلائل سے بہتر ثابت کر دے میں ان کا ہم مذہب و ہم خیال ہونے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ اپنی رائے پر کوئی برہان انی یا لمی قائم کر سکیں۔

اہل مذاہب اگرچہ دنیا میں بیشمار ہیں مگر مشہور مذاہب اور موجود بالفعل جو قابل اعتبار ہو سکتے ہیں یہ ہیں۔ (۱) مجوس (جن کو پارسی بھی کہتے ہیں)۔ (۲) ہنود۔ (۳) یہود۔ (۴) نصاریٰ۔ (۵) اہل اسلام اور اہل اسلام میں مشہور بڑے فرقے دو ہیں۔ (۱) اہل سنت والجماعت (جن کے مشہور فرق دو ہیں۔ اگرچہ تعداد فرق ان کی بہت ہے۔ ا۔ اشاعرہ، ۲۔معتزلہ) ۲۔فرقہ اہل اسلام شیعہ امامیہ اثناعشریہ ہے۔ اگرچہ مطلق شیعہ کے بھی بہت سے فرقے ہیں۔ مگر مشہور بڑا فرقہ یہ ہے۔ ان سب کے اعتقادات کی مختصر مختصر حالت گزارش کی جاتی ہے۔

مجوس

میرا خیال ہے کہ یہ فرقہ بہت قدیم ہے اور غالباً ہنود کے مذہب سے بھی مقدم ہو۔ یہ دونوں فرقے بہت سی باتوں میں متفق ہیں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا ماخذ ہے۔ مثلاً مجوس بھی آفتاب کو قابل عبادت وحمد وستائش جانتے ہیں، ہنود بھی۔ مجوس بھی چاند کو قابل پرستش سمجھتے ہیں، ہنود بھی۔ مجوس بھی آگ کو معبود جانتے ہیں، ہنود بھی۔ یہ بات تو بالتفصیل آگے معلوم ہوگی مگر یہاں اس قدر معلوم کرنا چاہیے کہ مجوس کے مذہب کی نسبت ملل و نحل کے مصنف محقق عالم عبدالکریم شہرستانی نے کیا لکھا ہے:

یہ بھی معلوم رہے کہ اس مذہب کی کئی شاخیں ہیں اگرچہ حاصل ان سب کا تقریباً ایک ہی طرف رجوع کرتا ہے۔

ا۔مجوسیہ: شہرستانی لکھتے ہیں:

ثم الثنوية اختصت بالمجوس حتى اثبتوا اصلين اثنين مدبرين قديمين يقتسمان الخير والشر والنفع و الضر والصلاح والفساد يسمون احدهما النور والثانى

الظلمة و بالفارسیه یزدان واھرمن

''جس کا حاصل یہ ہے کہ ثنویہ فرقہ مجوس سے خاص ہے۔ ان لوگوں نے دو اصلیں مدبر قدیم ثابت کی ہیں یعنی خالق عالم خدا دو ہیں۔ ان دونوں نے نیکی بدی، نفع نقصان اور صلاح و فساد کو آپس میں بانٹ لیا ہے۔ ایک نیک کام کرتا ہے، دوسرا بدکام۔ ایک کا کام نفع پہنچانا ہے تو دوسرے کا کام نقصان۔ ایک کا کام صلاح پیدا کرنا ہے دوسرے کا کام فساد۔ ان دونوں میں ایک کا نام نور ہے دوسرے کا نام ظلمت۔ فارسی میں ان کو یزدان اور اہرمن کہتے ہیں۔''

جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے اعتقاد میں دو خدا اور دو خالق ہیں۔ جتنے اچھے کام ہوتے ہیں یزدان سے ہوتے ہیں اور جتنی برائیاں ہیں اہرمن سے ہوتی ہیں۔ (اب رہی یہ بات کہ دو خالق کا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ عقل بھی تجویز کرتی ہے یا نہیں، یہ آگے معلوم ہوگا)۔

۲۔ **کیومرثیہ:** ان کے نزدیک صرف یزدان تو قدیم ہے۔ اہرمن حادث و مخلوق ہے۔ یزدان نے ایک مرتبہ غور کیا کہ اگر میرا کوئی مخالف ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ خراب فکر جو اسے لاحق ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظلمت پیدا ہوگئی اسی ظلمت کا نام اہرمن ہے۔ چونکہ اہرمن فاسد فکر سے ہوا تھا۔ اس لیے اس کے مزاج میں شر و فساد تھا۔ آخر اس نے نور (یزدان) پر چڑھائی کی اور ان کے لشکروں میں خوب جنگ ہوئی۔ مگر فرشتوں نے بیچ بن کر ان کے درمیان صلح کرا دی۔ وہ صلح اس طور پر قرار پائی کہ عالم سفلی تو خالص اہرمن کے قبضے میں رہے اور عالم علوی یزدان کے قبضے میں۔ لیکن سات ہزار برس کے بعد اہرمن اپنا قبضہ اٹھائے اور پھر دونوں عالم یزدان کے ہو جائیں۔ (خلاصہ: صفحہ ۷۳-۷۴، ملل و نحل شہرستانی برحاشیہ ملل و نحل ابن خرم ظاہری)۔

اس بنا پر اگر فرض بھی کر لیا ہے کہ یہ موحد ہے اور اہرمن کو حادث مانتا ہے، تب بھی اس مذہب کی تنگ خیالی اسی سے ظاہر ہے کہ اپنے معبود کو ایسا جانتا ہے کہ اس میں خراب اور اچھی دونوں فکریں آیا کرتی ہیں۔ اس میں خوف بھی پیدا ہوتا ہے اسے مخالف کا ڈر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی کے دماغ بھی ہے جس سے وہ فکر وغور کرتا ہے اور جب دماغ ہوا تو جسم بھی ضرور ہو گا۔ لہٰذا خدائے تعالیٰ جسے وہ یزدان کہتے ہیں اچھا خاصہ آدمی ہوگا جس میں ان سب مذکورہ بالا باتوں کا ہونا ممکن ہے۔ پھر تو پروردگار بھی قدیم اور واجب الوجود نہ ہو سکے گا۔ وہ بھی اگر اس کے قدیم ہونے کے قائل ہیں تو ان کی غلطی ہے کیونکہ جو مجسم ہو اور اس میں فکر ردی وصحیح دونوں پیدا ہو سکیں وہ حادث اور ممکن الوجود ہوگا نہ واجب الوجود اور قدیم۔ (اس کی تشریح آگے معلوم ہو گی)۔

۳۔ زروانیہ: ان کا خیال یہ ہے کہ نور (جو ان کا خدا ہے) نے نوری اشخاص پیدا کیے تھے اور وہ سب کے سب روحانی و ربانی تھے۔ لیکن ان کا بڑا شخص جو زروان تھا اس کو کسی معاملہ میں شک پیدا ہو گیا اس شک کی وجہ سے اہرمن شیطان پیدا ہوا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ زروان نو ہزار نو سو ننانوے برس تک ریاضت کرتا رہا کہ اس کے کوئی بیٹا پیدا ہو مگر نہ ہوا۔ آخر اسے یہ خیال ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ شاید یہ عالم کچھ بھی نہیں ہے محض دھوکا ہے۔ اس خیال فاسد کی وجہ سے اہرمن پیدا ہو گیا اور اس علم کی وجہ سے ہرمز۔ مگر دونوں کا حمل ایک ہی پیٹ میں قرار پایا۔ اہرمن چونکہ حیلہ گر تھا اس لیے جھٹ ماں کا پیٹ پھاڑ کر نکل آیا اور تمام دنیا پر قبضہ کر لیا۔ پھر بہت دنوں بعد ہرمز کو سلطنت دنیا ملی۔

بعض زروانیوں کا یہ خیال ہے کہ خدائے تعالیٰ میں یا تو کوئی خراب وردی فکر تھی یا کوئی بدبودار چیز تھی جس سے اہرمن (شیطان) پیدا ہوا۔ (اس مذہب کی عقلمندی اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے معبود کے لیے بدبودار چیز، ردی فکر، بیٹے کا پیدا ہونا، ہرمز، اہرمن معبود کے بیٹے

ہیں وغیرہ وغیرہ تجویز کرتا ہے)۔

۴۔ مسخیہ ہے: ان کا خیال ہے کہ نور (خدائے تعالٰی) تنہا تھا، خالص تھا۔ پھر اس کا ایک حصہ مسخ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظلمت پیدا ہوئی۔ (اب بھی دونوں مدبر عالم ہیں)۔ آدمی پر فالج گرنا اور اس کے کسی عضو کا بیکار ہو جانا تو سنا ہے اور دیکھا بھی ہے۔ مگر معلوم نہیں مجوسیوں کے خدا پر کیسا مادہ فاسد گرا جس نے اس کو بیکار اور مسخ کر دیا۔ میرے خیال میں ان کے ایسے مہمل خدا پر فالج ہی گرا ہو گا جس سے اس کا ایک حصہ بیکار ہو گیا اور اس سے اہرمن پیدا ہوا۔ (پناہ بخدا۔ دنیا میں اس عقل کے بھی لوگ ہوتے ہیں۔)

۵۔ زردشتی: زردشت مدعی نبوت کے پیرو! یہ زردشت گشتاسپ بن لہراسپ بادشاہ ایران کے زمانہ میں تھا۔ اس کی رائے میں خدا واحد ہے۔ لاشریک ہے مگر عالم کا مبدا اس کے نزدیک بھی نور اور ظلمت ہے۔ انہیں دونوں کے خِلط مِلط سے تمام عالم پیدا ہوا ہے۔

۶۔ مانویہ۔ مانی بن فاتک کا فرقہ: یہ شخص زمانہ شاپور بن اردشیر میں تھا جو زمانہ حیات مسیح علیہ السلام سے متاخر ہے۔ اس نے یہ خیال کیا ہے کہ عالم مصنوع و مرکب تو ہے مگر دو قدیم اور ازلی اصلوں سے بنا ہے۔ ایک نور، دوسرے ظلمت۔ یہ دونوں ازلی الوجود اور ابدی الوجود ہیں۔ نہ کبھی معدوم تھے نہ کبھی معدوم ہوں گے۔ یہ دونوں، دو قوتیں ہیں۔ جن میں حس سماعت، بصارت بھی موجود ہے۔ نفس، صورت، فعل اور تدبیر میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا نفس اچھا، دوسرا کا بُرا۔ ایک کی صورت اچھی، دوسرے کی بُری۔ ایک کا فعل اچھا، دوسرے کا بُرا ہے۔

غرض یہ تمام فرقے مجوس کے نور و ظلمت کے قائل ہیں۔ سوائے زردشتیوں کے اور باقی تمام فرقے انہیں دو کو خدا مانتے ہیں۔ خیر و شر کا فاعل انہیں کو سمجھتے ہیں اس لیے یہ فرقہ موحد نہیں ہے۔ علاوہ اس کے جو خرابی اس خیال میں ہے وہ یہ ہے کہ دو خدا یا بعبارت اُخروی دو

خالق خدیم ازلی کا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ جب دو قدیم ازلی ہوں گے تو یقیناً دونوں مرکب ہوں گے اور جو چیز مرکب ہے وہ حادث ہوتی ہے قدیم نہیں ہوسکتی۔

نیز یہ خیال کہ یزدان۔ یا نور صرف قدیم ہے مگر اس میں فکر ردی یا عفونت تھی جس سے ظلمت یا اہرمن یا شیطان پیدا ہوا۔ اس یزدان کی نہایت درجہ کمزوری کو ثابت کرتا ہے ہمیں تو ایسا خدا نہیں چاہیے جس میں بدبو، گندیدگی، نقص، فکر فاسد ہو۔ علاوہ بریں ایسا خدا حادث ہو گا جس میں اس قسم کی حادث چیزیں پائی جاتی ہوں۔ پھر تو اس کے لیے کسی اور خدا کی ضرورت ہوگی جس نے اسے پیدا کیا ہو اور وہ خود خدا نہیں ہو سکے گا۔

اس فرقہ کی کمزوری زیادہ تر اس سے سمجھی جاتی ہے کہ یہ لوگ آفتاب، چاند، آگ اور صبح، غرض ہر روشن چیز کو قابل عبادت و پرستش جانتے ہیں حالانکہ یہ سب کے سب کسی خالق کے مخلوق ہیں اور کسی صانع کے مصنوع ہیں، حادث ہیں، عدم سے وجود میں آئے ہیں، بے حس و بے ادراک ہیں۔ قابل زوال ہیں کسی کی عبادت کا احساس نہیں کر سکتے۔ پھر اصلی اور حقیقی معبود کو چھوڑ کر ان مصنوعات کی پرستش کرنا عجیب ہے۔ معلوم نہیں کہ کیونکر ان کے بانیان مذہب نے ایسے کمزور خیالات اختیار کیے تھے۔

اس امر کا ثبوت کہ یہ لوگ آفتاب، چاند، آگ اور صبح کو پرستش کے قابل جانتے ہیں۔ ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے جو ژند پاژند میں مذکور ہیں۔

آفتاب کی حمد و ثنا مع متن و شرح

گویا خدائے تعالیٰ زردشت کو سکھاتا ہے کہ تم اس طرح آفتاب سے دعا کرو اور اس کی ثناء وصفت کیا کرو "درود بر تو زند شہائے یزداں و فرجہاش۔ یعنی سلام و تحیت کہ دعائے جاویداں زیسعن بود بر تو۔ اے روشنگر بزرگتر و گروندہ و ستودہ فجستہ و ہمایوں تر تابندہ از آفریندہ بے مایہ و مادنکش یعنی روشن شدہ از نور خالق خود کو بے ہمتا و بے امتداد زمان ترا

آفریدہ۔ گروندۂ درفزوں مر مستر گش آفریدۂ خود بگردش سپہر خود کہ پاکسی از پذیرفتن۔ کشودہ شدن و پارہ گشتن و تازہ پیکر گرفتن و کہنہ پیکر گذاشتن و گردش راست ناچرخی۔ یعنی گردش کنندہ بگردش فلک خودش کہ از قبول کشادہ شدن و خرق و تجدید صورت بری ست از حرکت مستقیمہ برکران (ناچرخے حرکت مستقیمہ چرخی کہ حرکت دوری باشد" (ژند پاژند صفحہ ۳۳-۳۴)

غرض اسی طرح کئی ورق تک آفتاب کی ثنا وصفت وحمد و نماز کے طریقے مندرج ہیں۔ پھر اس کے بعد چاند کی نماز ہے۔ چنانچہ اس کے بھی چند جملے نذر ناظرین ہیں (صفحہ ۳۹)

"نموفیتہ وتیاعہ نموفیتہ دیتہ۔ نماز بماہ دیدہ شدہ و نماز بدیداراد۔ و خوشنونرہ اہورہہ مزدا اشم دہی۔ سہ گفتن فروورانہ ہر گاہ کہ باشد۔ ماتکبہہ سہ گوچترہہ کی غشمچہ ابودواتیاکی غسچہ فوعرو سرہ ویا خشنوترہ یساغچہ و ہماسچہ خشنوترا عچہ فرہ سستہ ہچہ۔ ماہ گوسفند تخمہ راو کاوایوہ دادارو گوسفند پر سرورہ رایزش دنیائش و دعا۔ و خوشنودی و ستائش میکنم"۔

غرض کئی ورق تک چاند کی نماز مذکور ہے۔ اس کے بعد آگ کی نماز ہے (صفحہ ۴۴) نموسی آترش مزدا آہورہہ ہو دافزشتہ نیرہ تہ۔ نماز بتوائے آتش بلند ترین ولایق ستائیدن و پیدا کردنہ اور مزد نیک پیدایش پیدا کنندہ۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں (صفحہ ۳۵۔ ژند پاژند)

"اشتہ بویا اہماعہ یزہ یسر تو یادہ فرا یزاعتہ ایسموز یستوبر سموز سگو گا عوز ستوہا و نورستو۔ نیک بختی باو شخصے راکہ ترا ہمیشہ سے ستاید ایسم بدست و برسم بدست و جیوام بدست و ہاون بدست گرفتہ۔ یعنی ہر کس کہ ایں آلاتہاے یزش رابدست گرفتہ اور ابستاید بدونیک بختی باد"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں تمام طاقتیں مثل خدا کے تسلیم کی گئی ہیں۔ (صفحہ ۳۶۔ ژند پاژند)

"وایامی آترش فترو آہورہہ یزدا آرسو خاترم آسوسراعینم اسوجیتم فرعرو خاترم فوعروسراعیتم فوعروحیتم۔ اے آتش عزیز اور مزدتیز آسانی و تیز پرورش و تیز ہوشنی و بر آسانی و بر پرورش و بر زندگی بخش بمن مستتم سیفانوخشوو ورم بزدام اشہ جزو تیم فسجیۃ مسہ تم مراغتم اورونہ اشہ خرہ تیم فسجیتہ مسہ تم مزاعتم افیرہ آترم یزیام فسجیتہ ہام درہ،تیم۔ بزرگی و دانش و شیرینی و فصاحت زبان و ہوشیاری براے رواں و پس ازاں خرد بزرگ کہ بابزرگی نامضطرب باشد و پس ازاں ہمت نیک مردانگی بنجش بمن"۔

غرض اسی طرح کی دعائیں آگ سے کی گئی ہیں اور آگ کی حمد وثنا ادا کی گئی ہے۔ اس کے بعد صبح کو دعا دی گئی ہے اور اس کی بھی نماز کا طریقہ لکھا گیا ہے۔ ژند پاژند کے دیکھنے والے کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے مصنف کے نزدیک جس طرح ''معبودِ حقیقی'' قابل پرستش ہے اسی طرح سورج، چاند، آگ، صبح بھی قابل پرستش ہیں۔ اور ان کو اس طرح خطاب کیا گیا ہے جیسے خدائے تعالیٰ کو خطاب کرنا چاہیے۔ اور ان سے اسی طرح دعائیں مانگی گئی ہیں جیسے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی جانی چاہیے۔ ان کو صاحب روح، صاحب حواس، صاحب ادراک، صاحب عقل، صاحب گوش وچشم تسلیم کیا گیا ہے۔ ان میں قدرت تسلیم کی گئی ہے۔ غرض جو ایک خدائے حقیقی کی صفت ہونی چاہیے وہ ان میں مان لی گئی ہے۔ مگر باوجود اس کے ان کو خدا کا بنایا اور پیدا کیا ہوا بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ مجھے زردشت پیغمبر مجوس سے اس بات کا تعجب ہے کیونکہ یہ تو خالق عالم کے وجود اور اس کے قدم کے قائل ہیں پھر کیونکر ان کو جرأت ہوئی کہ ایسی بے حس چیزوں کی بھی عبادت کرنے کا طریقہ لوگوں کو سکھایا۔ کیا سوائے معبود حقیقی کے کوئی مخلوق بھی پرستش کے قابل ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو پھر معبود حقیقی اور ان مخلوقات میں کیا فرق رہا۔

اب دیکھیں اس مقام پر اسلام کی توحید کو۔ اہل اسلام خدائے تعالیٰ کے سوا کسی کو قابل پرستش نہیں سمجھتے۔ ہاں عناصر و موجودات عالم کو مخلوق خدا عجیب صنعت خدا کا نمونہ۔ اس کے آثار قدرت جانتے ہیں۔ مگر ان کو قابل عبادت نہیں جانتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بے حس و ادراک ہیں۔ ان میں اتنی طاقت نہیں کہ بالارادہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ نفع یا نقصان پہنچانا ان کا طبعی فعل ہے جس کا ان کو خود ادراک نہیں ہوتا۔ جیسے (مثلاً) ملٹھی کا اثر کھانسی کو دفع کرنا۔ کنین کا اثر بخار کو روکنا۔ سنکھیا کا اثر زندہ کو مار ڈالنا ہے۔ مثلاً یہ افعال خواص طبعی ہیں ان کے اختیار و ارادہ سے ان کا کوئی فعل نہیں ہوتا۔ یہ سب اپنے وجود

میں دوسرے کے محتاج ہیں۔ خصوصاً آگ تو حد سے زیادہ دوسری چیز کی محتاج ہے۔ ایک تو اسے ایندھن کی ضرورت ہے، اگر ایندھن نہ ہو فوراً بجھ جاتی ہے۔ دوسرے اسے روشن کرنے والے کی ضرورت ہے۔ آپ سے آپ آگ پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے اسباب و آلات مہیا کیے جاتے ہیں، ان سے آگ نکالی جاتی اور پھر بڑھائی جاتی ہے۔ پھر کس قدر افسوس ہے کہ جو چیز ہمارے اختیار میں ہو اور ہمارے علاوہ اور چیزوں کی محتاج ہو اس کو ہم سجدہ کریں۔

یہ تو حال زردشتیوں کا ہے جو خدائے واحد کے وجود کے بھی قائل ہیں لیکن ان کا کیا حال ہوگا جو نور و ظلمت ہی کو دراصل خدا جانتے ہیں۔ یا صرف نور ہی کو خدا جانتے ہیں اور ظلمت کو اس سے پیدا ہوا مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو آفتاب، چاند، آگ وغیرہ سب ہی خدائے حقیقی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ مذہب موحد نہیں ہے۔ اور صفات معبود حقیقی کو بالکل نہیں سمجھ سکا ہے۔ ان میں صرف زردشتی کسی قدر موحد ہیں مگر چونکہ آگ وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں اس لیے یہ بھی مشرک ہو گئے۔

ہنود

ہنود بھی اپنے تئیں موحد کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ زبانی طور پر خدائے تعالیٰ کے بہت سے ایسے صفات بیان کرتے ہیں جو بالکل صحیح ہیں۔ مثلاً خدائے تعالیٰ نرنکار ہے۔ خالق ہے، مالک ہے، حی و قیوم ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر عملی طور پر اور نیز ان کی کتب کی تعلیم کے طریقے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی تو ان کا مذہب کچھ اور ہے مگر مسلمانوں کی صحبت کے اثر سے ایسا ہو گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی طور پر موحد بن گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ لوگ اگر غور کریں گے تو ضرور مسلمانوں کے اس معاملہ میں شریک ہو جائیں گے۔ ان کا عمل بالکل توحید کے برخلاف ہے۔ بتوں کی پرستش کرنی جنہیں آدمی خود ہی اپنے ہاتھوں سے

بناتے ہیں، کس قدر تعجب خیز ہے کیونکہ علاوہ اس نقصان کے کہ آدمی ہی کے مصنوع ومخلوق ہوتے ہیں۔ یہ بھی خرابی ہے کہ نہ تو وہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، نہ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہیں۔ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ اگر تم انہیں سونے کا خول پہنا دو تو انہیں کچھ نہیں، اگر پھٹا چیتھڑا پہنا دو تو انہیں کچھ خبر نہیں، توڑ ڈالو تو انہیں محسوس نہیں ہوتا، بڑی حفاظت سے رکھو تو انہیں کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ اس پر زیادہ تر قابل افسوس تو یہ بات ہے کہ یہ مورتیں جگائی جاتی ہیں۔ ان کے آگے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں تاکہ جاگیں اور ان کی دعاؤں کو سنیں۔ کیا معبود کی یہی شان ہونی چاہیے؟

ان کی کتابیں بھی توحید کا سبق نہیں سکھاتیں۔ مسئلہ حلول یعنی یہ کہ پروردگار تمام چیزوں میں حلول کرتا ہے۔ یا یہ کہ تمام چیزیں عین خدائے تعالٰی ہیں۔ ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ دیکھو(۱) آتئی ترابرہمنا۔ منتر اوّل صفحہ ۲۶)

(۱) ''انسان کا جسم بنا کے اس نے (خدا نے) اس کے کاسۂ سر کو پھوڑ ڈالا اور اس کے وسیلہ سے روح ہو کر داخل ہوا۔ اس لیے یہ (روح) برہم ہے۔ (یعنی خدا ہے)

(۲) تئی ترابرہمنا۔ صفحہ ۸۷۔ ''پرمیشور نے اپنے آپ میں چاہا کہ تمام چیزوں کو پیدا کروں اور اپنے اس ارادے کو پورا کرنے کے لیے وہ تپسیا کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے تمام چیزوں کے مادے کو پیدا کیا اور تب اس نے ان کو اپنی روح دی اور اس طرح سے وہ خود ہی تمام چیزیں بن گیا۔ خواہ وہ دیدنی یا نادیدنی تھیں۔ وہ خود ہی گیان اور اگیان بنا، اور خود ہی ست اور است ہوا۔ اگر کوئی آدمی کسی چیز کو پرمیشور نہ جانے تو وہ ہاویہ دوزخ میں جائے گا۔''

(۳) سوتیا سوتر، منتر ۳۔ ''تو ہی عورت ہے اور تو ہی آدمی ہے، تو ہی لڑکا ہے تو ہی لڑکی ہے اور تو ہی خود ہی ہر ایک چیز ہے۔''

(۴) مشٹریک۔ ادہائے ۲۔ پاؤ، ۳۔ سوتر ۴۴۔ ''وید سکھلاتا ہے پرمیشور ہی خود ہر ایک چیز ہے۔''

(۵) شٹریک اڈہائے ۲۔ پاؤ، ۳۔ سوتر ۴۵۔ ''پرمیشور فرماتا ہے کہ تمام جیو میرے بھاگ ہیں۔ وہ کہاں کہتا ہے؟''

بھاگوت گیتا۔ ادھائے ۱۵ اور ادھائے ۱۳ میں

(۶) گوپت برہمنا میں لکھا ہے:

''وہ جو خدمت کرتا ہے برہم ہے۔ جو چوری کرتا ہے وہ بھی برہم ہے۔ جیو ہو کے میں۔ ہر ایک چیز میں رچ گیا ہوں۔''

رگ وید۔ بھاگ ۲۔ سوکت۔ ۹ صفحہ ۳۴۹۔ ''صرف پرمیشور ہی یہ تمام دنیا ہے جو کچھ ہو چکا ہے وہی تھا اور جو کچھ ہوگا وہی ہوگا۔ وہ مرتا نہیں موت اس کے قبضہ میں ہے اور خوراک کھا کر وہ بڑھتا ہے۔'' (خدائے تعالیٰ خوراک کھاتا ہے۔ عجیب)

(۱۰) منتر دہم۔ ''گھوڑے اور تمام حیوانات جو دو قطار دانت رکھتے ہیں گائے، بکری، بھیڑ اس سے نکلے ہیں۔''

(۱۱) منتر ۱۱۔ ''جب وہ تمام چیزیں بنا چکے (یعنی خدا صاحب) تو انہوں نے اس کو کتنے حصوں پر تقسیم کیا۔'' اس کا منہ کیا تھا۔ اس کے بازو کیا تھے۔ اس کی رانیں کیا کہلاتی تھیں اور کیا اس کے پاؤں۔

(۱۲) منتر ۱۲۔ ''برہمن اس کا منہ تھے۔ راجنیا۔ اس کے بازو تھے۔ وہ جو ویش تھے اس کی رانیں ہوئے اور شودر اس کے پاؤں سے نکلے۔''

(۱۳) منتر ۱۳۔ چاند اس کے دماغ (مانس) سے نکلا۔ سورج اس کی آنکھ سے۔ اندر

اور اگنی اس کے منہ سے۔ وایو (ہوا) اس کے سانس سے۔

اتھرو وید۔ کانڈ ۱۹۔ سوکت ۲۔ منتر ۵۔۷۔ ''اس کا منہ کیا ہے اس کے بازو کیا ہیں۔ اس کی رانیں کیا ہیں۔ اس کے پاؤں کیا ہیں۔ برہمن اس کا منہ ہیں۔ راجا، اس کے بازو ہیں۔ ویش اس کی رانیں ہیں اور شودر، اس کے پاؤں ہیں۔ اس کے منہ سے اندر اور اگنی اتپن ہوئے۔ اس کے سانس سے وایو۔ اس کی ناف سے زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ، اس کا سر آسمان ہے۔ اس کے پاؤں سے دنیا پیدا ہوئی۔ اور چہار اطراف اس کے کانوں سے نکلے۔''

یہ تمام عبارتیں کھڑک سنگھ صاحب اودھو کے ترجمے سے لی گئی ہیں جو انہوں نے بصورت لیکچر کے مسٹر مارٹن کلارک صاحب کی مدد سے لکھے ہیں۔ ان تمام عبارتوں سے توحید کے معاملہ میں بہت کچھ قصور سمجھ میں آیا۔ اول تو وحدتِ وجود کا مسئلہ سمجھا گیا۔ حالانکہ بالکل خلاف عقل ہے کہ خدا اور مخلوقات ایک ہی ہوں۔ اگر ایسا ہوگا تو لازم آئے گا کہ ایک آدمی۔ مثلاً جب سچ بولتا ہے تو دراصل وہ خدا ہی ہے اور جب جھوٹ بولتا ہے تو دراصل وہ خدا ہی ہے۔ جس وقت زنا کرتا ہے تو وہ خدا ہی ہے اور جس وقت اپنی زوجہ سے صحبت کرتا ہے تو وہ خدا ہی ہے۔ جب ظلم کرتا ہے تو وہ خدا ہی ہے اور جب انصاف کرتا ہے تو بھی وہ خدا ہی ہے۔ لہٰذا دنیا میں کوئی شخص قابل مذمت نہیں رہے گا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کرتا ہے خدا ہی کا فعل ہے۔ اس میں کسی کو دخل نہیں ہے۔

اس میں ایک اور خرابی یہ لازم آئے گی کہ عبادت اور تپسیا بالکل فضول ٹھہرے گی۔ اس لیے کہ جب آدمی مثلاً خود ہی خدا ہے تو وہ کس کی عبادت کرتا ہے کیا اپنی ہی؟ کیا کوئی عقل اس بات کو تجویز کر سکتی ہے کہ ایک شخص معبود بھی ہوا اور عابد بھی۔ مالک بھی ہو، غلام بھی۔ خالق بھی ہو مخلوق بھی۔ اللہ بھی ہو، بندہ بھی؟ جب یہ نہیں ہے تو عبادت بیکار ہے حالانکہ

یہ لوگ عبادت کرتے ہیں۔ پھر اس کے کیا معنی ہیں؟

تیسری خرابی جو اس سے لازم آتی ہے یہ کہ خدا فانی بھی ہو اور باقی بھی۔ کیونکہ اپنی ذات سے تو وہ باقی ہے مگر جب آدمی۔ گھوڑا، خچر، پتھر، درخت، گھاس وغیرہ ہوا تو فانی ہوا، کیونکہ یہ سب چیزیں فانی ہیں۔ نیز یہ کہ بے تغیر بھی ہو با تغیر بھی کیونکہ یہ سب چیزیں اور ایک حال سے دوسرے حال پر بدلتی رہتی ہیں۔

پھر ان بیانات سابقہ سے خدا کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے کیونکہ اس کو جہان کے پیدا کرنے کے واسطے عرصہ تک تپسیا کرنا پڑی تھی۔ کیسا کمزور خدا ہوگا جو صرف اپنے حکم سے جہان کو پیدا نہ کر سکا، بلکہ عرصہ تک اس کو ریاضت کرنی پڑی۔

پھر سابقہ عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ مرکب ہے تب تو اس کے منہ، رانیں، پیٹ، ناف، پاؤں وغیرہ ہوئے جن سے برہمن، شودر، راجا، ویش پیدا ہوئے۔ اور جب وہ مرکب ہوا تو حادث ہوا قدیم نہ ہوا حالانکہ اس کو قدیم ازلی مانا گیا ہے۔ یہ ہے کمیٔ توحید۔ اس کو خوب سمجھیں۔

مجھے اس بات سے بھی بہت تعجب ہے کہ جب ہادیان مذہب ہنود نے خدا شناسی کے میدان میں قدم رکھا اور اس کے وجود اور قدامت اور خالقیت رزاقیت، علم، قدرت وغیرہ صفات کمالیہ کو سمجھے اور قابل عبادت جان لیا، تو پھر کیا ہو گیا کہ اندر (آسمان یا بالائی قوت) اگنی (آگ)، چاند، سورج، صبح، شام، ہوا، پانی، زمین کی بھی عبادت کرنے لگے۔ کیا یہ سر جو تعظیم کے لیے جھکایا جاتا ہے اسی قابل ہے کہ ایسی مخلوق چیزوں کے آگے جھکے جن میں اختیاری کوئی طاقت نہیں، بلکہ صرف خالق کے حکم سے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔'' کیا پانی کو یہ اختیار ہے کہ جب ہم اس کی بندگی کریں گے تو ہمیں کسی وقت ڈوبنے سے بچا لے گا؟ کیا اگر آگ کی عبادت کریں گے تو ہم کو نہ جلائے گی کبھی ایسا نہ ہوگا۔ اگر صد سال گبر آتش فروزد چو یکدم اندر آں افتد بسوزد۔

اس پر جو ہم دیکھتے ہیں کہ ویدوں میں صرف انہیں کی عبادت کی ہدایت کی گئی ہے اورانہیں کی عبادت کے طریقے بتائے گئے ہیں تو سخت تعجب ہوتا ہے۔

ہمارے پاس رگ وید کا حصہ۔ انو کا اٹھارھواں سکت (۱) تک ماسٹر لچھمن داس صاحب مدرس سینٹ سٹیفز کالج دہلی کا ترجمہ کیا ہوا موجود ہے مطبوعہ مطبع مرتضوی۔ اس میں سوائے آگ، سورج، چاند، اندر، وغیرہ کی عبادت کے اور کچھ ذکر ہی نہیں۔ خدائے تعالیٰ کا تو کہیں نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔

شروع ہی کتاب سے آگ پرستش کی تعلیم دی گئی ہے۔

ورک (۱) میں اگنی دیوتا کی جو ہوم کا بڑا گرو۔ کارکن اور دیوتاؤں کو نذریں پہنچانے والا۔ اور بڑا ثروت والا ہے۔ مہما کرتا ہوں (حمد کرتا ہوں)۔

ورک (۵) ایسا ہو کہ اگنی جو نذروں کا پہنچانے والا اور علم کا حاصل کرنے والا اور سچا نامور دیوتا ہے معہ دیوتاؤں کے یہاں آوے۔

سوکت ۳

(۱) اے اگنی معہ تمام دیوتاؤں کے سوم کا رس (میٹھا عرق) پینے کو ہمارے پوجا میں آ اور نذر پیش کر۔

(۸) ان دیوتاؤں کو جن کی ہم پرستش اور تعریف کرتے ہیں سوم کا رس ارگ چڑھتی وقت پلا۔

(۳) اے اگنی اندر۔ وایو برہپتی۔ مترا۔ اگنی پستان، بھاگا۔ ادیتاوں اور مروت کے گروہوں کو نذر پیش کر۔ (یہ سب نام دیوتاؤں کے ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے)۔

سکت ۶

(۱) ”یہ تیز اور نعمتوں سے پُر سوم کا رس چڑھایا گیا ہے۔ اے وایو (ہوا) آ اور اس چڑھائے ہوئے رس کو پی۔“

(۲) ہم اندر (آسمان) اور وایو (ہوا) دونوں دیوتاؤں کو جو دیولوگ میں رہتے ہیں۔ سوم کا رس پینے کو بلاتے ہیں۔ (دیوتا کو رس پلایا جاتا ہے)

انوکا ۱۲۔ سکت ۱

(۳) ''اگنی خوراک کے مانند خوشگوار ہے۔ زمین کے مانند وسیع ہے۔ پہاڑ کے مانند ترکاریوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ پانی کی مانند خوش نما ہے۔ وہ گھوڑے کے مانند ہے جس کو رن میں حملہ کرنے کو دباتے ہیں اور بہنے والے پانی کے مانند ہے اسے کون روک سکتا ہے۔''

غرض اسی طرح۔ اندر (آسمان) ہوا، اگنی، مارت جو اندر کا مددگار ہے۔ اسونوں، درن، تروتی وغیرہ دیوتاؤں کی عبادت کے طریقے اور ان کی حمد اس تمام حصہ رگ وید میں مذکور ہے۔ علاوہ خدائے تعالیٰ کی کہیں ایک حرف بھی حمد و ثنا نہیں۔[1]

یہود

ان کے پانچ فرقے ہیں۔ (۱) سامریہ، (۲) صدوقیہ جو حضرت عزیر نبی کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں، (۳) عنانیہ، (۴) ربانیہ اور (۵) عیسویہ (اصحاب ابوعیسیٰ اصبہانی)

ان پانچوں میں سے صرف صدوقیہ فرقہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہتا ہے اور یہ بات توحید کے بالکل برخلاف ہے کیونکہ اگر اس کے بیٹا ہو تو ضرور ہے اس کے کوئی جورو بھی ہوگی اور جب جورو ہوئی تو اس سے ہمبستری کی بھی نوبت آئے گی۔ اس طرح تو خدائے تعالیٰ کا تجسیم

۱۔ یہ کمزوری صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ عناصر و افلاک و نجوم کے جو تاثیرات عالم میں دیکھے گئے تو ابتدائی زمانے کے آدمی جن کی عقلیں محدود، علم محدود، خیالات محدود تھے ان کو اپنا معبود سمجھنے لگے۔ یہ تو سمجھے نہیں کہ یہ سب مخلوقات ہیں۔ ہمارے ہی فائدے کے لیے ان کو کسی اور مدبر عالم نے پیدا کیا ہے وہاں تک تو نظر پہنچ نہ سکی انہیں مادہ و مادیات میں پھنس کر رہ گئے۔ اور اب بھی جبکہ علم و عقل کا زمانہ ہے اسی لکیر کے فقیر چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم ایسے معبود حقیقی، خالق عالم مدبر جہان، قادر مطلق، صناع عجائب اشیاء کو چھوڑ کر کیا بے اختیار چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔ حالانکہ عقل صحیح اسے پسند نہیں کرتی۔

ثابت ہوتا ہے جو اسے حادث بنائے دیتا ہے حالانکہ وہ قدیم ہے۔

توریت جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے عمل درآمد کی کتاب ہے اس میں بھی خلاف معرفت وتوحید بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً خدا کا باغ میں ٹہلنا۔ کیا وہ کوئی آدمی ہے جسے تفریح کے واسطے باغ میں سیر کرنے کی ضرورت ہے۔ (دیکھو کتاب مقدس مطبوع لودیانہ مشن پریس صفحہ ۷)

(قصہ آدم وحوا میں) ''اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی جورو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔''

اگرچہ آدمؑ وحوا کا قصہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے مگر اس میں خدائے تعالیٰ کا باغ میں ٹھنڈے وقت پھرنا نہیں لکھا گیا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ توریت موجود محرف ہے ورنہ اس میں ایسی خلاف عقل باتیں نہ ہوتیں۔

ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ خدا کے بہت سے بیٹے تھے۔ یہ مفہوم اس عبارت کا ہے جو آئندہ مذکور ہوگی۔ (دیکھو کتاب مقدس مطبوع لودیانہ مشن پریس ص ۱۱) ''جب زمین پر آدمی بہت ہونے لگے اور ان سے بیٹیاں ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وے (وہ) خوبصورت ہیں اور ان سبھوں سے جو پسند آئیں اپنے لیے جورواں لیں۔'' تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرے گی وہ تو بشر ہے تو بھی اس کے دن ایکسو بیس برس اور ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ کے ایک چھوڑ بہت سے بیٹے ہیں اور آوارہ بھی ہیں، کیونکہ آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھ کر للچائے اور ان کو اپنی جورویں بنانا چاہا۔ مگر خدائے تعالیٰ نے روک دیا۔

توریت موجودہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انجام کا حال معلوم نہیں ہے وہ اپنے کاموں میں غلطی بھی کرتا ہے۔ اور جب اس کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے تو آخر پچھتاتا ہے۔ (دیکھو کتاب مقدس ص ۱۱ مطبوع لودیانہ مشن پریس)۔

''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل میں تصور اور خیال روز بروز صرف بدہی ہوتے ہیں تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔''

معلوم ہوتا ہے کہ محرف توریت کی دماغی قوت اسی قدر تھی کہ وہ اپنے حقیقی معبود لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے واسطے ''دل'' اور ''افسوس'' وغیرہ تجویز کرے۔ (دیکھو کتاب مقدس ص ۱۵ مطبوع لودیانہ مشن پریس آیت ۲۱)۔

''اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے لیے میں زمین کو پھر کبھی لعنت نہ کروں گا۔ اس لیے کہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے کیا ہے پھر سارے جانوروں کو نہ ماروں گا۔''

توریت حضرت موسیٰ کے قصے میں تو خدائے تعالیٰ کی رویت وجہ کا انکار کرتی ہے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں بتاتی ہے کہ ابراہیم کو خدا دکھائی دیا۔ جس سے اس کا مجسم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (دیکھو کتاب مقدس کتاب پیدائش ص ۲۱ آیت ۷)

''تب خداوند نے ابرام (ابراہیمؑ پیغمبر) کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔''

توریت یہ بھی سبق دیتی ہے کہ آدمی اور خدا کی ایک ہی صورت ہے اور جب اس کی کوئی صورت ہوگی تو اس میں مادہ بھی ضرور ہوگا جس پر اس صورت کو قیام ہے۔ لہٰذا مرکب ہو

گا اور جب مرکب ہوگا تو ضرور ہے کہ اپنے مرکب ہونے سے پہلے معدوم رہا ہوگا۔ کیا کوئی عقل یہ تجویز کر سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ بھی معدوم رہا ہو۔ اس بات کے ثبوت کے واسطے۔ (دیکھو باب پیدائش ص ۴۔۵ کتاب مقدس آیت ۲۶-۲۸)

''تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اور اپنے مانند بنا دیں کہ دے (وہ) سمندر کی مچھلیوں پر اور آسمان کے پرندوں پر اور مویشیوں پر اور تمام زمین پر اور سب کیڑے مکوڑوں پر جو زمین پر رینگتے ہیں، سرداری کریں اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔''

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی خدا کے مانند ہے کیونکہ اس نے آدمی کو اپنے مانند اور اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جسے اکثر مسلمانوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ داؤد خوارزمی کا قول آئندہ آئے گا۔ وہ کہتے تھے کہ:

''خدا کے ہاتھ، پاؤں، منہ، آنکھ، ناک، خون، گوشت، بال (اور وہ بھی گھونگر والے) سب ہیں۔''

مسلمانوں نے آدمی کا بصورت خدا ہونا بھی بیان کیا ہے اور اس پر یہ تہمت لگائی ہے کہ رسولؐ خدا نے ایسا فرمایا ہے۔ (دیکھو کتاب ملل ونحل شہرستانی۔ جلد اول ص ۱۴۰-۱۴۱)۔ ''اور تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ خدا نے اپنے رسول محمد مصطفےٰ سے مصافحہ بھی کیا ہے۔'' اور یہ بات آپ رسولؐ خدا نے بیان فرمائی ہے۔ (معاذ اللہ من ذالک)

یہی گروہ مسلمانوں کا مشبہ کہا جاتا ہے۔ ان کو شیعہ اثنا عشری گروہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ جن کے اماموںؑ کی بیان کردہ توحید اس رسالہ میں مندرج ہوگی۔

اس بات کا ثبوت کہ یہودیوں کی کتاب توریت سے تجسیم باری تعالیٰ کا مسئلہ

مسلمانوں نے لیا ہے۔ وہ ہے جو آئندہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ خداوند تعالیٰ کھانا بھی کھاتا ہے، جیسا کہ وید کا پہلے قول نقل ہو چکا ہے کہ: خدائے تعالیٰ خوراک کھا کر بڑھتا ہے۔
(دیکھو کتاب مقدس مطبوعہ لودیانہ مشن پریس ص ۲۸-۲۹)

''پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اسے (ابراہیمؑ کو) نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی اور کیا دیکھا کہ تین مرد اس کے پاس کھڑے ہیں وہ انہیں دیکھ کر خیمے کے دروازے سے ان کے ملنے کو دوڑا اور زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا کہ اے خداوند اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو اپنے بندے کے پاس سے چلے نہ جایئے کہ تھوڑا سا پانی لایا جاوے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت کے نیچے آرام کیجئے۔ (کیونکہ معاذ اللہ خدا صاحب چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ اور بیٹھایا بھی کہاں......؟ درخت کے نیچے اپنے خیمے میں نہ آنے دیا۔) ''میں تھوڑی روٹی لاتا ہوں تازہ دم ہو جایئے۔ اس کے بعد جایئے گا کیونکہ اسی لیے اپنے بندے کے یہاں آئے ہیں۔'' (یعنی روٹی کھانے۔ واہ رے معرفت خدا کی بھی خوب ہی قدر کی)۔

اس قدر نقل عبادت توریت کی اہل بصیرت کے واسطے کافی ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہود کو خدائے تعالیٰ کی کس درجہ معرفت حاصل تھی۔ اور ان کے خیالات اس کی نسبت کیا تھے۔ ان کی قوت دماغیہ کہاں تک تھی اور اب بھی جو اسی رائے پر جمے ہوئے ہیں تو کہاں تک ان کا یہ جمود قابل قدر ہے میں نے اس مقام پر صرف اسی قدر نقل کرنا کافی سمجھا ہے کیونکہ آئندہ میرا ارادہ ہے کہ جب تمام دنیا کے مذاہب پر مفصل بحث کروں گا اور ایک مستقل کتاب انشاء اللہ

ترتیب دوں گا اور ان کا اسلام سے مقابلہ کروں گا، اس وقت اور بھی باتیں توریت وغیرہ سے دکھائی جائیں گی جو بالکل خلاف عقل ہیں۔

عیسائی

ان کے قدیم فرقے تین معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب دو فرقے الگ ہو گئے ہیں، مگر ان سب کے خیالات تقریباً تثلیث پر دائر ہیں:

پہلے فرقہ ملکائیہ ہے۔ دوسرا نسطوریہ اور تیسرا یعقوبیہ۔

ملکائیہ، کا یہ خیال ہے کہ کلمہ بدن مسیح کی صورت میں ہو گیا، اور اس نے انسانی لباس پہن لیا، اور کلمہ کی تعبیر اقنوم العلم کرتے ہیں اور روح القدس کو اقنوم الحیوٰۃ کہتے ہیں مگر جب تک اقنوم العلم نے انسانی لباس نہیں پہنا تھا، اس وقت خدا کا بیٹا نہیں ہوا۔ جب پہن لیا تو خدا کا بیٹا ہو گیا۔

ان کا خیال ہے کہ "مسیح ناسوت (انسان) کلی ہیں، قدیم ازلی ہیں، قدیم ازلی سے پیدا ہوئے ہیں، اور مریم نے خدائے قدیم ازلی کو جنا تھا۔ صلیب جو دی گئی تھی تو جسم انسانی پر واقع ہوئی۔ لاہوت (ان کی الٰہیت) پر نہیں واقع ہوئی۔" (کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا تو قدیم ازلی ہے۔ جسے اس نے پیدا کیا وہ بھی قدیم ازلی ہو گیا۔ حالانکہ عقل بتاتی ہے کہ اسے حادث ہونا چاہیے نہ قدیم)۔

نسطوریہ کا یہ خیال ہے (جو حکیم نسطور کے پیرو ہیں جس کا ظہور زمانہ مامون رشید عباسی میں ہوا تھا) کہ اللہ تعالیٰ تو واحد ہے مگر اس میں تین اقنوم ہیں۔ ایک وجود، دوسرے علم، تیسرے حیاۃ۔ (یہاں تک مضائقہ نہیں کیونکہ یہ صفتیں ایک معبود برحق میں ہونی چاہئیں) یہ تینوں اقنوم نہ زائد بر ذات، اور نہ عین خدائے تعالیٰ ہیں۔ اور کلمہ (جس سے مراد اقنوم علم ہے) جسد عیسیٰ سے متحد ہو گیا مگر نہ بطور امتزاج اور نہ بطور ظہور تیہ بلکہ بطور اشراق آفتاب کے کسی

شیشہ کی شے پر یا جیسے نقش انگوٹھی پر اُبھر آتا ہے۔

ان میں سے اکثروں کا یہ بھی خیال ہے کہ ابن (بیٹا خدا کا) ہمیشہ سے پیدا ہوا تھا۔ (ہمیشہ سے پیدا ہونے کی بھی ایک ہی کہی۔ جو چیز عدم سے وجود میں آئی اور پیدا ہوئی اس کے لیے ہیشگی کہاں) یہاں صرف بدن مسیح سے متحد ہو گیا اور اس جسم میں نمودار ہوا جبکہ مسیح پیدا ہوئے۔ لہٰذا وہ خدا بھی ہیں اور انسان بھی۔ یہ دونوں ہی دو جوہر۔ دو اقنوم۔ دو طبیعتیں ہیں۔ ایک جوہر قدیم ہے۔ دوسرا جوہر حادث ہے۔ اِلٰہ تام ہے اور انسان تام۔ اس اتحاد نے نہ قدیم کے قِدم کو باطل کیا اور نہ حادث کے حدوث کو لیکن دونوں ایک مسیح بن گئے۔ (یعنی واجب الوجود واجب ہی رہا۔ اور ابن حادث، حادث ہی رہا۔ پھر بھی دونوں مل کر ایک مسیح کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ سبحان اللہ فلسفہ دانی اتنی تو ہو)۔

یعقوبیہ، کا بھی خیال ہے کہ اقانیم تین ہیں۔ اور وہ کلمہ جس سے حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے وہی خون اور گوشت بن گیا۔ لہٰذا خدا ہی مسیح ہو گیا۔ اور اس نے ان کے بدن میں ظہور کیا، بلکہ خدا اور مسیح دونوں ہی ایک ہیں۔ (ان میں ان میں کچھ فرق نہیں) ملل ونحل شہرستانی صفحہ ۲۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶)

اب میں تھوڑی تھوڑی انجیلوں کی عبارت بھی پیش کروں گا۔ جس سے ان کے مذہب کی حقیقت بخوبی معلوم ہو جائے۔ اور یہ ثابت ہو جائے کہ عیسائی فرقہ ہرگز موحد نہیں ہے جس طرح سے یہ لوگ زمانہ قدیم میں حضرت (عیسیٰ) مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا عین خدائے تعالیٰ سمجھتے تھے اسی طرح اب بھی ان کو معاذ اللہ خدا کا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔

چنانچہ انجیل مرقس کا شروع ہی یہاں سے ہوا ہے۔ ''خدا کے بیٹے یسوع مسیح کی انجیل کا شروع۔''

انجیل متی باب ۱۲، آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷۔ ''اسی وقت یسوع پھر کہنے لگا کہ

اے باپ آسمان اور زمین کے خداوند میں تیری تعریف کرتا ہوں کہ تو
نے ان چیزوں کو داناؤں اور عقلمندوں سے چھپایا اور بچوں پر کھول دیا۔
ہاں اے باپ کہ یوں ہی تجھے پسند آیا۔ میرے باپ سب کچھ مجھے
سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا مگر باپ اور کوئی باپ کو نہیں جانتا
مگر بیٹا۔"

پھر آگے چل کر خود ہی حضرت عیسیٰؑ نے اپنے تئیں ابن آدمؑ کہا ہے جو بالکل خدا کا بیٹا ہونے کے منافیہ ہے۔ ملاحظہ ہو، انجیل متی باب ۱۲ آیت ۴)

"کیونکہ جب یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ ویسا ہی ابن
آدمؑ تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔"

یہ اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بعد صلیب کے تین روز تک دفن رہے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔

انہیں حضرت عیسیٰؑ کو کہیں معاذ اللہ یوسف نجار کا بیٹا بھی بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو انجیل لوقا باب ۳، آیت ۲۴)

"اور یسوع آپ برس تیس ایک کا ہوا جب شروع کیا اور جیسا کہ گمان
تھا وہ یوسف کا بیٹا تھا۔ اور وہ ہیلی کا۔" (انجیل یوحنا باب ۱۴، آیت ۱)

"میرے باپ کے گھر میں بہت مکان ہیں۔ نہیں تو میں تمہیں کہتا جاتا
ہوں تاکہ تمہارے لیے جگہ تیار کروں۔"

اور اسی انجیل میں یہ بھی مذکور ہے کہ "حضرت عیسیٰؑ اپنے تئیں خدا کا رسول کہتے تھے نہ بیٹا۔" (دیکھو انجیل یوحنا باب ۷، آیت ۱۶)

"یسوع نے انہیں جواب میں کہا کہ میری تعلیم میری نہیں بلکہ اس کی

ہے جس نے مجھے بھیجا۔"

خیر یہ تو تناقضات ہیں جو انجیلوں کی عبارت میں ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ مطلب تو یہاں صرف اس قدر ہے کہ عموماً عیسائی لوگ حضرت عیسیٰؑ پیغامبر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ صریح الزام ذات پروردگار پر ہے اور جس سے اس کا ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے۔ جو محال ہے۔

اہل اسلام

یہ فرقہ بہت سے فرقوں پر منقسم ہو گیا ہے چنانچہ سچے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی فرمادی تھی۔

"ستفترق امتی علی ثلثه و سبعین فرقه کلها فی النار الا واحده"

مگر آخر دو بڑے گروہوں پر منقسم ہو گئے: ا سنی اور ۲ شیعہ

سنی فرقے کے بھی بیشار فرقے ہیں جو کتاب ملل شہرستانی اور ملل ونحل ابن خرم کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کے دو تین بڑے فرقوں کے اصول مذہب یہاں بطور نمونہ کے دکھائے جائیں گے۔ جن سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ کس درجہ کے موحد ہیں۔

معتزلہ:

اس فرقے کو اگر چہ صاحب ملل ونحل یعنی شہرستانی نے مجوس امت محمدیہ بتایا ہے اور اس پر ایک حدیث بھی جناب رسالت مآبؐ کی نقل کی ہے اور غالباً صرف اس وجہ سے کہ یہ فرقہ توحید میں نہایت سچا ہے اور جو حق واجب توحید ہے اس کا قائل ہے۔ یہ فرقہ خدائے تعالیٰ کو قدیم مانتا ہے۔ صفات خدائے تعالیٰ کو زائد بر ذات نہیں سمجھتا بلکہ عین ذات خدا سمجھتا ہے ورنہ تعدد قدما لازم آئے گا جو عقلاً محال ہے کلام خدا کو مخلوق و حادث بتاتا ہے۔ (اور واقعی بھی یوں ہی ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے کلام کو حروف و اصوات کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ نہ

یہ کہ وہ خود کلام ہے یا کلام اس میں چمٹا ہوا ہے) خدائے تعالیٰ کے دیدار کا منکر ہے اسے محال بتاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کو مخلوقات سے مشابہہ نہیں بتاتا۔ غرض جو اعلیٰ درجے کی توحید ہونی چاہیے وہ اس فرقے میں موجود ہے۔ صرف شیعوں میں اور ان میں اگر اصولی اختلاف ہے تو باب امامت میں۔ یہ لوگ ثلاثہ کو خلفائے برحق جانتے ہیں اور شیعہ بموجب نص قرآنی اور احادیث رسول علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو خلیفۂ برحق بلا فاصلہ مانتے ہیں۔

اشعریہ:

اصحاب ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری کے چند خیال منافی توحید معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اشاعرہ خدائے تعالیٰ کی ذات اور صفت میں تفرقہ کرتے ہیں اور اس کے صفات کو اس کی ذات سے علیحدہ ایک چیز قدیم مانتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ تعدُّد قدماء ہے جو عقلاً محال ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا ہی کو فاعل نیک و بد ٹھہراتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں جو کچھ نیک و بد کام بندوں سے ہوتا ہے سب خدا ہی کرتا ہے۔ (شہرستانی لکھتے ہیں صفحہ ۱۲۲ جلد ۱ ملل ونحل)

> قال ابوالحسن. الباری تعالی عالم بعلم قادر بقدرة حی بحیاة. مرید بارادة متکلم بکلام سمیع بسمع بصیر ببصر یعنی: ''اللہ تعالیٰ علم سے عالم ہے۔ قدرت سے قادر ہے۔ حیاۃ سے زندہ ارادہ سے مرید ہے کلام سے متکلم قوت سامعہ سے سننے والا ہے۔ قوت باصرہ سے دیکھنے والا ہے۔''

غرض جو طریقے انسان کے کام اور ادراکات کے ہیں بعینہٖ ''ویسے ہی'' خدا کے لیے بھی انہوں نے ثابت کیے ہیں۔

ان کے نزدیک ''کلام'' خدا کے نفس میں قائم ہے۔ جسے کلام نفسی سے تعبیر کرتے

ہیں۔(صفحہ۱۲۳) والکلام عند الاشعری قائم بالنفس سوی العبارة بل العبارة لالة علیه من الانسان۔

اس میں خرابی یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا محل اشیاء کثیرہ ہونا لازم آتا ہے کیونکہ جب بصارت، سماعت، قدرت، علم، ارادہ، کلام، حیاۃ وغیرہ علیحدہ سے اس کی ذات میں قائم ہوئے تو اس کی ذات ان سب کا محل قرار پائی۔ اب دو حال سے خالی نہیں۔ ا۔ یا یہ کہ صفات قدیم ہوں گے۔ ۲۔ یا حادث ہوں گے۔ اگر قدیم ہیں تو ایک چھوڑ کئی قدیم کا وجود لازم آئے گا۔ حالانکہ کئی قدیم نہیں ہو سکتے ورنہ سب کا مرکب ہونا لازم ہوگا اور جب سب کے سب مرکب ہوں گے تو یقیناً سب کے سب حادث ہو جائیں گے۔ پھر کوئی بھی قدیم نہ رہے گا۔ یہاں تک کہ پروردگار عالم بھی حادث ہو جائے گا۔ معاذ الله من ذلك۔

کئی قدیم نہ ہو سکنے کی ایک موٹی دلیل تو یہ ہے کہ جب ہم کسی چیز کو دو یا تین یا چار مثلاً کہتے ہیں جیسے چار گھوڑے، تین درخت، پانچ آدمی، دو قدیم تو ضرور ان میں باہم کوئی چیز ایسی بھی ہے جو سب میں پائی جاتی ہے اور کوئی چیز ایسی بھی ہوتی ہے جس سے وہ ایک دوسرے سے متمائز اور علیحدہ علیحدہ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً زید، عمرو، بکر، خالد۔ یہ چار آدمی ہیں۔ ان کو چار آدمی کیوں کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ چاروں میں ایک چیز مشترک پائی جاتی ہے یعنی آدمیت اور انسانیت۔ جیسا زید انسان ہے ویسا ہی عمرو ہے، ویسا ہی بکر ہے، ویسا ہی خالد انسان ہے۔ لہٰذا یہ چار انسان ہوئے۔ پھر ان کو چار کیوں کہا گیا۔ زید زید کیوں ہوا، عمرو عمرو کیوں ہوا، بکر، بکر کیوں، خالد، خالد کیوں ہوا؟ اسی وجہ سے کہ ان کی صورتیں الگ الگ ہیں۔ ان کی شباہتیں الگ الگ ہیں۔ ان کا طرزِ گفتگو الگ الگ ہے، ان کے قوائے ظاہری و باطنی الگ ہیں۔ غرض اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جن سے یہ علیحدہ علیحدہ پہچانے جاتے ہیں اور جن سے یہ چار شخص، چار شخص کہے گئے۔ معلوم ہوا کہ ان میں کم از کم دو چیزیں پائی جاتی

ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو ان سب میں برابر پائی جاتی ہے یعنی انسانیت۔ دوسرے وہ چیز ہے جو سب میں الگ الگ ہے، وہ ان کی صورتیں ہیں۔ لہذا یہ چاروں ان دو چیزوں سے مرکب ہوئے۔ اسی لیے حادث ہیں پس اگر دو یا چار قدیم ہوں گے تو اسی طرح ایک چیز ان میں مشترک ہوگی اور ایک وہ ہوگی جس سے یہ علیحدہ علیحدہ سمجھے جاسکیں اور ان میں باہم تمائز ہوا۔ لہذا یہ چاروں قدیم ان دو چیزوں سے مرکب ہو جائیں گے۔

اور ظاہر ہے جو چیز مرکب ہوتی ہے۔ وہ اپنے اجزاء کے وجود سے پیچھے موجود ہوتی ہے۔ دیکھو شربت انار کہاں تھا؟ جب تم نے شکر اور عرق دانہ انار ملایا اور ان کو پکا کر ترکیب دی تب شربت انار بنا پہلے صرف شکر تھی اور عرق تھا شربت نہ تھا۔ جب دونوں مل گئے تب شربت ہوا۔ لہذا شربت بہ نسبت اپنے اجزا شکر و عرق کے پیچھے حادث ہوا۔

پس اگر چند قدیم مرکب پائے جائیں گے۔ تو ضرور وہ اپنے اجزا کے وجود سے متاثر ہوں گے۔ لہذا حادث ہوں گے کوئی بھی ان میں قدیم نہ رہے گا۔ تو اس سے خدائے تعالیٰ جو قدیم ہے۔ اس کا بھی حدوث لازم آئے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ ایک وقت میں وہ موجود نہ تھا جب اس کے اجزا مل لیے تب اس کا وجود ہوا۔ اور جب ایسا ہوا تو ضرور ہے کہ اس کے پہلے کوئی ان اجزا کا باہم ملانے والا بھی ہوگا۔ لہذا وہ بہ نسبت اس خدا کے قدیم ہوگا حالانکہ تم نے اسی خدائے مرکب کو قدیم کہا تھا۔

خلاصہ یہ کہ خدائے تعالیٰ اسمہٗ و عز مجدہٗ کی توحید حقیقی اس وقت عقل کے نزدیک مسلم ہوسکتی ہے جبکہ مان لیا جائے کہ اس کے سوا کوئی قدیم ازلی نہیں!!!

اگر وہ صفات حادث ہیں تو لازم آئے گا کہ کسی وقت خدا تعالیٰ بے علم بھی تھا۔ بے حیات بھی تھا۔ بے قدرت بھی تھا۔ بے سمع بھی تھا۔ بے بصر بھی تھا۔ حالانکہ کوئی عقلمند اس بات کو خدائے تعالیٰ کی نسبت نہیں کہہ سکتا۔

علاوہ اس کے خواہ تم صفات زائدہ کو قدیم مانو یا حادث جب تم ان کو ذات خدا سے علیحدہ سمجھو گے تو تم کو کہنا پڑے گا کہ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو قدرت سے مدد لیتا ہے۔ جب جاننا چاہتا ہے تو علم سے مدد لیتا ہے۔ جب سننا چاہتا ہے تو سماعت سے مدد لیتا ہے۔ جب دیکھنا چاہتا ہے تو بصارت سے مدد لیتا ہے اور جب زندہ رہنا چاہتا ہے تو حیات سے مدد لیتا ہے!! یہ کیسا خدا ہوا جو اپنے کاموں میں اور چیزوں کا محتاج ہے۔ یہ کیسا خدا ہے کہ بذاتہٖ زندہ نہیں ہے بلکہ ایک علیحدہ زندگی سے زندہ ہے۔ تو کیا اس زندگی کے آنے سے پہلے مردہ تھا؟ کیا یہی شان خدائے تعالیٰ ہونی چاہیے؟ حاشا وکلا۔

پھر اگر تمام نیک و بد کاموں کا پیدا کرنے والا خدا ہی کو سمجھو تو اس سے بڑھ کر کوئی بھی ظالم نہ ہوگا کیا تم خدا کو ظالم سمجھتے ہو؟

کیا عقل یہی کہتی ہے کہ خدا ہی خود بندے کے منہ سے شراب پیے، بندے کے ہاتھوں سے جوا کھیلے، بندے کے اعضاء سے زنا کرے، بندے کے ہاتھ پاؤں سے نماز پڑھے، بندے کے ذریعے سے حج و زکوٰۃ وغیرہ ادا کرے اور پھر اس کو سزا یا جزا بھی دے؟ حالانکہ یہ صریح ظلم ہے۔ خود ہی ہم سے جھوٹ بلوائے، اور پھر خود ہی ہمیں سزا دے، خود ہی ہم سے جوا کھلوائے اور خود ہی عذاب بھی ہم پر کرے۔ یہ کیسی لغو بات ہے!!

دیکھو اگر کوئی آدمی زبردستی کسی کے حلق میں شراب ڈال دے اور پھر اس سے کہے، تو نے کیوں شراب پی۔ اب تو مارا جائے گا۔ تو ایسے شخص کو لوگ کیا کہیں گے؟ کیا ظالم بے رحم، ناانصاف نہ کہیں گے؟ پھر کیا تم خدا کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟ ہرگز یہ خیال عقل کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انسان اپنے فعل آپ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اسے ہدایت کر دی ہے کہ یہ نیک کام ہے، یہ بد کام ہے۔ اگر اسے کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ اگر اسے کرو گے۔ تو جزا پاؤ گے۔ البتہ آلات ایسے پیدا کر دیے ہیں جن سے دونوں کام برابر ہو سکتے ہیں

یہی ہاتھ ہے۔ اس سے چاہو کسی کو سلام کرو، چاہو کسی کو طمانچہ مارو۔ یہی منہ ہے چاہو، اس سے جھوٹ بولو، چاہو سچ بولو۔ یہی آنکھ ہے چاہے اس سے نامحرموں کو دیکھو، چاہے اس سے قرآن کے مضامین کو دیکھ کر ان میں غور کرو۔ یہی کان ہیں، چاہے ان سے گانا سنو، غیبت سنو، چاہے اس سے موعظہ سنو۔ احکام الٰہیہ سنو۔ یہی پاؤں ہیں، چاہے ان سے شراب خانے میں جاؤ چاہے مسجد میں۔

مگر اس نے بتا دیا ہے کہ اگر ویسا کرو گے تو سزا پاؤ گے جہنم میں جلو گے۔ اگر ایسا کرو گے تو جنت میں جاؤ گے جزا پاؤ گے۔

اگر یہ کہو کہ اچھا پھر ایسے آلات ہی کیوں بنائے جن سے دونوں کام ہو سکیں کیوں نہ ایسے بنائے کہ جن سے صرف نیک ہی کام ہو سکتے؟

تو بھائی! اس کا جواب یہ ہے کہ پھر تمہاری تعریف ہی کیا رہتی۔ اگر تم اس صورت میں نیک ہی کام کر سکتے تو تم ان نیک کاموں کے کرنے پر مجبور ہو۔ اور جس سے بجبر کوئی کام لیا گیا ہو وہ شخص ہرگز اس کام کے کرنے پر قابل داد نہیں ہو سکتا۔ ایک بوڑھا آدمی اگر زنا نہیں کرتا تو اس کی کیا تعریف ہے، جبکہ اس کے پاس وہ آلہ ہی نہیں جس سے زنا کرے۔ ایک گونگا آدمی اگر جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی کیا تعریف ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس وہ آلہ ہی نہیں ہے جس سے جھوٹ بولے۔ ایک بہرا آدمی اگر غیبت نہیں سنتا، یا ایک مفلوج آدمی چوری نہیں کرتا، یا ایک اندھا بُری نظر سے کسی کو نہیں دیکھتا تو ان کی تعریف ہی کیا ہے۔ اگر ان کے آلات اس قابل ہوتے اور پھر ہدایت خدا پر عمل کر کے ان کاموں کو نہ کرتے تب قابل تعریف ہوتے!! ایک جوان آدمی جب تمام ظلم و فحش، زنا، بدنظری، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچتا ہے تو لوگ اسے کہتے ہیں، کیا جوان صالح ہے۔ حالانکہ اس کے پاس بھی وہ آلات موجود ہیں جن سے وہ ان کاموں کو کر سکتا ہے لیکن حکم خدا کو ماننے کی وجہ سے برے کام نہیں کرتا۔ لہٰذا قابل

تعریف ہوا۔

نیز، اگر ایسا ہی ہوتا کہ تم سوائے نیک کاموں کے برے کام نہ کر سکتے تو انبیاء کا آنا بیکار ہوتا کتابوں کا خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا فضول ہوتا، کیونکہ یہ سب ہدایت کے واسطے آئے ہیں اور جب تم آپ ہی ایسے ہو کہ ہمیشہ اچھے کام کرتے ہو، برے کام کرتے ہی نہیں، تو ہدایت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اور کسے ہدایت کی جاتی۔ یہ انبیاء تو اسی لیے آئے تھے تاکہ تم کو نیک اور بد راہیں بتا دیں اور تمھیں سمجھا دیں کہ اگر وہ کرو گے، جزا کے مستحق ہو گے، اگر یہ کرو گے، سزا کے لائق ہو گے۔ پس اگر خدا ہی تمہارے سب افعال کا خالق ہو تو کس قدر فضول ہوتا ہے۔ انبیاء کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا۔ اور اسی طرح اگر تمہارے پاس آلات عمل بد کے ہوتے ہی نہیں تو ان کا آنا کس قدر لغو ہوتا سمجھو اور غور کرو۔

پھر ابوالحسن اشعری کا یہ بھی قول ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ بندوں کو تکلیف مالایطاق دیتا ہے اور دے سکتا ہے۔''

یعنی ایسی باتوں کا انسان کو حکم دے سکتا ہے یا دیتا ہے جنہیں انسان کر نہیں سکتا۔

(شہرستانی لکھتے ہیں: صفحہ ۱۲۴ الملل والنحل)

و تکلیف مالا یطاق جایز علی مذھبه یعنی ''امام اشعری کی رائے کے بموجب ایسی تکلیف جائز ہے جسے انسان نہ کر سکے۔ مثلاً پروردگار عالم، یہ حکم دے سکتا ہے کہ آدمی آسمان پر اڑ جائے حالانکہ اس کے پاس ایسے پر و بازو نہیں ہیں کہ جن سے وہ اڑ سکے (اور آسمان کو چھو سکے) اور جب باوجود اپنی بے بسی کے اس تکلیف محال کو نہ کر سکے تو اسے سزا بھی دیتا ہے کہ تو آسمان پر بغیر پر و بال وغیرہ کے کیوں نہ اڑ گیا۔

کیوں بھائیو! کیا عقل ایسی ہی باتیں خدائے تعالیٰ جلّ ذکرہٗ کی نسبت تجویز کرتی

ہے۔ کیا تمہارا عادل پروردگار ایسی ہی صفت کا ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو ہم ایسے خدا کے بندے نہیں ہونا چاہتے جو اتنا بڑا ظالم ہو۔

تعالیٰ اللہ عن ذٰلك علواً کبیراً اللہ اکبر جلَّ جلالہٗ و عزَّ مجدہٗ

جب تم ایک معمولی عقل کے آدمی کی نسبت یہ تجویز نہیں کرتے کہ وہ کسی کو ناممکن بات کا حکم دے تو خدائے تعالیٰ کی نسبت کیوں کر یہ بات تسلیم کر لی گئی۔ کیا تم کسی آدمی سے کہہ سکتے ہو کہ ایک گھنٹہ میں دہلی سے لکھنؤ کو پیدل چلے جاؤ؟ ہرگز نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم جانتے ہو کہ اس کے پاس ایسے آلات نہیں ہیں جن سے وہ تمہارا یہ حکم بجالا سکے تو کیا پروردگار عالم ایسا حکم دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں!!

کتاب عقاید نسفی جو اہلسنت والجماعت کے اعتقادات کا مجموعہ ہے اس میں بھی ویسے ہی اعتقادات ثبت ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:

ولہ صفات ازلیة قائمة بذاته و هی لاهو ولا غیره و هی العلم والقدرة والحیوة والقوة والسمع والبصر ولارادة والمشیة والفعل والتخلیق والترزیق والکلام و هو متکلم بکلام هو صفة له ازلیة و هو صفة مغائره منها فیه للسکوت والافة واللہ تعالیٰ متکلم بها

(صفحہ ۱۲ تا ۱۴ شرح عقاید نسفی مطبوعہ مطبع نظامی)

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں:

و رؤیة اللہ تعالیٰ جائزة فی العقل واجبة بالنقل و قدورد الدلیل السمعی با لجاب رویة المومنین للہ تعالی فی الدارا لاخرة (شرح عقاید نسفی عبارت متن صفحہ ۱۸

مطبوعہ مطبع نظامی)

ان دونوں عبارتوں کا حاصل[1] یہ ہے کہ صفات خدائے تعالیٰ نہ زاید برذات ہیں نہ عین ذات اور پھر اصل ذات واجب الوجود سے الگ بھی نہیں اور علیحدہ سے اس کی ذات میں قائم ہیں[2]۔ خدا کا دیدار ہوگا۔ مومنین قیامت میں خدا کو دیکھیں گے!! حدیثیں بھی اس قسم کی اس شرح میں نقل کی گئی ہیں کہ ''مومنین خدا کے چہرہ کو جنت میں دیکھیں گے (دیکھو شرح عقاید نسفی ص ۱۹)۔

جب خدا کے لیے چہرہ ہوا تو ہاتھ پاؤں کان آنکھ ناک بھی ضرور ہوں گے پھر تو خاصہ آدمی ہو گیا، خدا کیا ہوا۔

یہ بھی لکھتے ہیں: واللّٰہ تعالیٰ خالق افعال العباد من الکفر والایمان والطاعة المعصية (شرح عقاید نسفی ص ۲۰)

یعنی ''اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کفر، ایمان، طاعت اور معصیت کا پیدا کرنے والا ہے''۔ یعنی خود ہی کافر بناتا ہے، خود ہی لوگوں کو مومن بناتا ہے، خود ہی طاعت کرواتا ہے، خود ہی گناہ۔ سبحان اللہ! کیا معرفت ہے!! اے پروردگار! قسم ہے تیری ذات کی تو ایسا نہیں ہے۔ اگر واقعی تو ایسا ہی ہے تو ہم باز آئے تیری خدائی سے، تو تو بڑا ظالم نکلا، تو خود ہی لوگوں کو کافر بناتا ہے اور پھر آپ ہی ان پر عذاب کرے گا۔ ارے! یہ کیسا ظلم ہے۔ تو ہمارے ہاتھوں پر معصیت کو پیدا کرتا ہے اور پھر سزا دے گا۔ پھر تو تو کانا منصف ہے۔ نعوذ باللّٰہ

۱۔ اس فقرہ میں ایک عجیب بات اور ہے یعنی ارتفاع نقیضین آج تک کوئی عقلمند اس بات کا قائل نہیں ہوا کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں موجود بھی نہ ہو اور معدوم بھی نہ ہو۔ آخر کوئی شخص کیوں کر یہ بات کہہ سکتا ہے اگر وہ شے موجود نہیں ہے تو معدوم ضرور ہے اور اگر معدوم نہیں ہے تو موجود ضرور ہے یہ کیا معنی کہ موجود بھی نہیں معدوم بھی نہیں لا ھو ولا غیرہ کے یہ معنی ہیں کہ صفات پروردگار نہ اس کی عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ پھر آخر کیا ہیں۔ تیسری صورت تو ممکن ہی نہیں۔ اس کا جواب اگر کوئی سمجھا دے تو میں ممنون ہوں گا۔

مــن هــذه الاقـــوال۔

اکثر حضرات اہلسنت اس بات کے بھی قائل ہو گزرے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بالکل مجسم ہے۔ جیسے آدمی۔ اس کے گھونگھروانے بال بھی ہیں۔ گوشت، خون، ہاتھ، پاؤں سب ہیں۔ چنانچہ صاحب ملل ونحل لکھتے ہیں (ص ۱۳۹-۱۴۰ مطبوعہ بیروت)۔

و حـكـى الـكـعبى عن بعضهم انه كان يجوز الروية فى الدنيا يزوره و يزورهـم و حكى عن داؤد الخوارزمى انه قال اعفونى عن الفرج واللحية واسالونى عما ورآء ذلك و قـال ان مـعبودهـم جسيـم ولـحـم و دم لـه جوارح واعـضـآء مـن يـدورجـل و راس و لسـان و عينين و اذنيـن و مـع ذلك جسـم لا كالاجسام و لحم لا كاللحوم و دم لاكـالـدمـآء و كـذلك سائر الصفات و هو لا يشبهه شيئا من المخلوقات ولا يشبهه شئ و حكى انه قال هو اجـوف من اعلاه الىٰ صدره مصمت ماسوى ذلك و انه له و فرة سودآء وله شعر قطط۔

''یعنی کعبی نے بیان کیا ہے ان میں سے بعض کا قول کہ وہ تجویز کرتا تھا خدا کا دیدار دنیا ہی میں اور یہ کہ وہ اس کی زیارت کرتے ہیں اور وہ ان کی زیارت و ملاقات کرتا ہے۔ اور داؤد خوارزمی کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتا تھا مجھ سے نہ پوچھو کہ خدا کے فرج اور ڈاڑھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ اور سب باتیں مجھ سے پوچھو۔ وہ کہتا تھا کہ آدمیوں کا معبود جسم ہے، گوشت ہے، خون ہے۔ اس کے جوارح واعضاء بھی ہیں ہاتھ، پاؤں، سر، زبان، آنکھیں، کان اور باوجود اس کے وہ ایسا جسم

ہے کہ اور جسموں کا سا نہیں ہے اور گوشت ہے مگر اور گوشتوں کا سا نہیں، خون ہے مگر اور خونوں کا سا نہیں۔ اسی طرح اور تمام صفات ہیں اور وہ اپنے مخلوقات سے (باوجود اتنی مشابہتوں کے) مشابہ نہیں ہے اور نہ اور کوئی اس سے مشابہ ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتا تھا کہ خدائے تعالیٰ اعلائے بدن سے سینہ تک جوف دار ہے اور نیچے سے ٹھوس ہے اور یہ کہ خدا کے گھنے گھنے کالے بال اور گھونگھر والے ہیں۔"

اب ان سب مذاہب کے مقابلہ میں ملاحظہ ہو اثنا عشری شیعوں کے اماموں کی تعلیم جو توحید کی بابت ہے۔

"ان کی تعلیم ہے کہ صرف ذات خدائے تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے اس کے سوا سب حادث اور عدم سے وجود میں آئے ہیں۔"

ان کی تعلیم ہے کہ "صرف ذات خدائے تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے اس کے سوا سب حادث اور عدم سے وجود میں آئے ہیں۔"

"اس کا کوئی بیٹا نہیں، اس کی بیٹی نہیں، اس کی بیوی نہیں کیونکہ وہ ان سب سے غنی بالذات ہے۔ اس کے لیے جسم و مادہ و صورت و شکل نہیں۔"

☆ اس کا کوئی مکان نہیں، وہ عرش پر نہیں بیٹھا ہے۔

☆ اس کے مانند کوئی نہیں، اور نہ وہ کسی کے مانند ہے۔

☆ اس کے صفات عین ذات ہیں، اگر غیر ذات ہوں گے تو حدوقدماء لازم آئے گا جو محال ہے جیسا کہ سابق میں بیان ہوا۔"

غرض اور بہت سے امور تنزیہہ ہیں جو مختصات شیعہ اثنا عشری سے ہیں۔ میرا

خیال ہے کہ دنیا میں اگر کوئی قوم موحد اور خدائے تعالیٰ کی معرفت رکھتی ہے تو وہ صرف یہی قوم ہے۔

چونکہ دنیا اس بات سے ابھی بہت کچھ ناواقف ہے کہ گروہ شیعۂ اہل اسلام کے مقتدا کیسے لوگ تھے۔ ان کی زندگی کس قسم سے بسر ہوتی تھی۔ وہ اہل عالم کو کیا سبق سکھاتے تھے۔ ان سے اہل اسلام کو کیا کیا فائدے پہنچے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ ان حضرات کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلا کے دکھاؤں کہ آیا سچے بندے خدائے تعالیٰ کے یہ لوگ تھے یا کوئی اور۔ اور قابل تقلید و قابل اطاعت یہ لوگ تھے یا کوئی اور جن کی زندگی دنیا میں صرف اس طور سے بسر ہوئی کہ وہ توحید خدائے تعالیٰ کی تعلیم کرتے رہے۔ احکام الٰہی کو لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ علوم مختلفہ کی تعلیم فرماتے رہے۔ کیا طبعیات، کیا الٰہیات، کیا ریاضیات، کیا اخلاق، کیا تمدن، کیا تدبیر المنزل۔ جس علم میں دیکھو ان حضرات نے دریا بہا دیے ہیں اور کیسی سچی تعلیم دی ہے۔ کہ اگر تمام عالم کے فلاسفر جمع ہوں تو اس سے بہتر ایک حرف بھی نہیں بتا سکتے۔ باوجودیکہ یہ بزرگوار دنیا کی طرف سے کیسی کیسی زحمتوں میں رکھے گئے تھے۔ قید کیے گئے، قتل کیے گئے، زہر پلائے گئے۔ خفیہ نگہبان ہر وقت ان کے گھروں پر موجود رہتا کہ دیکھیں کیا زبان سے نکالتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ بادشاہ وقت کے مخالف کچھ کہتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے پاس آنے سے روکا جاتا تھا۔ ان کو کہیں جانے سے سخت ممانعت کی جاتی تھی۔ تمام خواہشیں ان کی مسدود کر دی گئی تھیں۔ جیسا کہ ایک مورخ یا تاریخ پر نظر رکھنے والے سے یہ باتیں مخفی نہیں ہیں۔ پھر بھی سوائے علوم حقیقیہ کی تعلیم کے اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان تمام علوم مذکورہ بالا میں اس قدر بیان فرما دیا ہے کہ آج سینکڑوں کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں مگر افسوس کہ نہ تو زمانہ انہیں دیکھتا ہے اور نہ اس کے پاس

قدر دان نگاہ ہے۔ جس سے حق و باطل کا تفرقہ کرے۔

کاش اب بھی زمانہ چونکے، جبکہ خود غرضیوں کے اسباب تمام مفقود ہو چکے ہیں اور صرف حق و باطل میں سوچ کر تفرقہ ہی کرنا باقی رہ گیا ہے۔ ذرائع تحقیق موجود ہیں فقط دیکھنے اور غور کرنے کی دیر ہے۔

میں سچ کہتا ہوں، اگر دنیا ان کی تعلیمات پر خفیف سی بھی نظر کرے تو کبھی ان کے سوا کسی اور کو اپنا پیشوا نہ مانے کیونکہ دراصل اگر کوئی سچا مذہب ہوسکتا ہے تو وہی ہوسکتا ہے جس میں اتنی تنزیہہ اور پاکی اور اخلاقی علمی، عملی تعلیمیں ہوں اور جن کے ایسے معلم ہوں، جو بغیر انسانوں سے تعلیم حاصل کیے ہوئے ایسے ایسے علوم کے ماہر تھے۔

اب میں مختصر طور پر ''توحید الائمۃ'' کا ترجمہ ناظرین کے سامنے حاضر کرتا ہوں۔ اس پر غور فرمائیں اور جو کچھ اس سے نتیجہ نکال سکیں اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ دنیا میں اگر کوئی چیز اہم سے اہم ہے تو وہ صرف مذہب ہے۔ ہر شخص ہوش سنبھالنے کے بعد پہلے اسی پر توجہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھ کو اپنے معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرنی چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ اس کی واقعی مرضی کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل کر کے اپنے لیے نجات اور آخرت کے عذاب سے بچاؤ کا ذریعہ حاصل کروں، اور ظاہر ہے کہ دنیا کا ہر مذہب صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس سبب سے کہ ان میں باہم اس قدر مخالفت ہے کہ ہر ایک کو سچا کہنا ناممکن ہے۔ دونوں باتیں کیوں کر صحیح ہوسکتی ہیں کہ خدا کے بیٹا بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ قابل پرستش صرف خدا ہی ہے اور قابل پرستش اس کی مخلوقات، آگ پانی پتھر وغیرہ بھی ہیں۔ خدائے تعالیٰ جسم بھی ہے اور بغیر جسم کے بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ عقلاً وہی مذہب سچا ہوسکتا ہے جس کی علمی عملی، اخلاقی، تمدنی الٰہی تعلیم انتہا درجہ کی پاک اور مقدس ہو۔ اب اس کا

فیصلہ کہ وہ کون سا مذہب ہے جس میں حد درجہ کی تنزیہہ اور پاکی ہے۔ ناظرین خود غور کرنے سے سمجھ سکیں گے یہاں اس لیے بطور نمونہ کے تمام مذاہب کے اقوال مختصر طور پر سابق میں دکھلا دیے ہیں تاکہ ہر ایک منصف آدمی کو فیصلہ کرنے کا موقع مل سکے۔

قاعدے کی بات ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا یعنی ''ہر چیز اپنی مخالف چیز کے دیکھے جانے سے پہچانی جاتی ہے۔'' کوئی شخص سیاہی کو سیاہی نہیں کہہ سکتا جب تک یہ نہ جانے کہ اس کے مخالف سفیدی یا سرخی بھی ہے۔ دن کو دن نہیں سمجھ سکتا جب تک اس کے مقابلے میں رات کو بھی نہ دیکھ لے۔

لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ عنوان رسالہ میں یہ باتیں لکھ دی جائیں اگرچہ مختصر طور پر ہوں تاکہ سیاہ و سفید۔ رات اور دن کا فرق ظاہر ہو جائے اور کسی کو اس کے بعد عذر کا موقع نہ رہے کہ ہمیں تو معلوم نہ تھا۔

اب آپ اس رسالہ کو ملاحظہ فرمائیں کہ وجود پروردگار عالم اور اس کا قدم اور اس کی قدرت کس عنوان سے ثابت کی گئی ہے اور کیا اس سے بہتر دنیا میں کوئی فلسفی تفصیل و تشریح کر سکتا ہے۔

آپ کو ابتدا ہی میں معلوم ہوگا کہ جو شخص درپے اثبات و بیان توحید ہے وہ کتنا بڑا حکیم، کتنا بڑا عالم علم نباتات و جمادات و حیوانات اور عالم تشریحات ہے۔ کس طرح کا خوش اخلاق، کتنا بڑا واعظ مقرر، کیسا حقانیت میں ڈوبا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے امور الٰہیہ پر غور کرنے کے اور دنیا میں اسے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اور واقعی بھی ایسا ہی ہے۔

اب میں اسے شروع کرتا ہوں جس کا وعدہ کر آیا ہوں اور خدائے تعالیٰ سے اس کے اتمام میں مدد مانگتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اسے مقبول خلائق بنا کر مفید خاص و عام

کرے۔ آمین ثم آمین۔

یہ حدیث جس کا ترجمہ پہلے شروع کیا جاتا ہے "حدیث مفضل" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ وہ اس کے راوی ہیں۔ اس حدیث میں تمام مخلوقات عالم جمادات، نباتات، حیوانات، افلاک اور سیاروں وغیرہ کی مفصل تشریحیں اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور انہیں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایسی حکمتیں بغیر کسی حکیم مدبر قادر کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوسکتیں۔ لہذا یہ اشیائے عالم مبین وجود خدائے تعالیٰ عز اسمہٗ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابن ابی العوجاء (دہریہ) اور فلسفہ توحید

محمد بن سنان روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے مفضل بن عمر نے بیان کیا کہ میں ایک روز عصر کے بعد جناب رسالتمآبؐ کے روضہ میں قبر و منبر کے درمیان بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ پروردگار عالم نے ہمارے سید محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا کیا شرف و فضائل عطا فرمائے ہیں۔ جسے عوام امت نہیں جانتے اور ان کے غایت فضل و کمال منزلت و عظمت مرتبہ سے ناواقف ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ابن ابی العوجاء (دہریہ اور نیچری آدمی تھا) بھی آ گیا اور اتنے فاصلے سے بیٹھا کہ میں اُس کی باتیں سن سکتا تھا۔ پھر اس کے ساتھیوں میں سے ایک شخص آیا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا۔ ابن ابی العوجاء نے یہ گفتگو شروع کی کہ صاحب اس قبر کا کامل عزت تک پہنچ گیا اور شرف و ہمراہی نے کہا، ہاں! وہ (محمد مصطفیٰؐ) ایک فلسفی آدمی تھا۔ اس نے بڑے مرتبے کا دعویٰ کیا اور اس پر ایسے معجزے بھی لایا جن سے عام عقلوں کو حیران کر دیا اور عقلا نے ان کو معلوم کرنے کے لیے فکر کے دریاؤں میں غوطے لگائے، مگر پھر بھی ناکام واپس آئے۔ جب اس کی اس دعوت کو عقلا، فصحاء، خطباء نے مان لیا تو عام طور پر لوگ فوج فوج اس کے دین میں آنے لگے اور جن جن شہروں تک اس کی دعوت نبوت پہنچی، وہاں وہاں کے عبادت خانوں اور مسجدوں میں ناموس اکبر (خدائے تعالیٰ) کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی شامل ہو گیا۔ اور بلند آواز سے پکارا جانے لگا۔ اس میں نہ تخصیص خشکی کی ہے نہ دریا کی، نہ پہاڑی ملکوں کی، نہ ہموار ملکوں کی، اور یہ بلند آواز سے پکارا جانا بھی کچھ ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہر شب و روز میں پانچ مرتبہ اذان میں اور پانچ مرتبہ مکرر مکرر اقامت میں۔ اس نے اپنا نام خدا کے نام کے ساتھ صرف اس لیے ملایا کہ اس کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے اور اس کے کام میں خمول نہ ہو۔

ابن ابی العوجاء بولا۔ محمدؐ کا ذکر تو چھوڑ، اس کے معاملے میں تو میری عقل حیران ہے اور میری فکر کو راستہ نہیں ملتا۔ اب کچھ اس اصل حال کا ذکر کر جس کے سبب سے محمدؐ کے دین میں لوگ داخل ہو رہے ہیں یعنی پروردگار عالم کا کچھ ذکر کر کہ آیا وہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ پھر اس نے اشیاء عالم کی ابتداء کا ذکر کیا کہ کیونکر یہ چیزیں بنیں۔ اور دعویٰ یہ پیش کیا کہ یہ چیزیں کسی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں، کوئی ان کا بنانے والا نہیں، کوئی ان کا مدبر و مصلح نہیں بلکہ یہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور یوں ہی دنیا چلی آتی ہے اور چلی جائے گی۔

مفضل کا دہریہ کو جواب

مفضل کہتے ہیں، یہ سن کر مجھے غصہ کے مارے تاب نہ رہی۔ میں نے کہا، اے خدا کے دشمن! خدا کے دین میں کفر کرتا ہے۔ تو نے بالکل اس پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا جس نے تجھ کو اس اچھی صورت میں پیدا کیا ہے اور ایسا تیرا بدیہ قرار دیا۔ اور ایک حال سے دوسرے حال میں نقل کرتا رہا، یہاں تک کہ تو اس حالت کو پہنچا (یعنی بچہ سے بڑا ہوا، بڑھ کر جوان ہوا جوان ہو کر، اب اس سن کو پہنچا) تو اگر صرف اپنے نفس کے متعلق فکر کرتا اور تیرا لطیف حاسہ تیرے ساتھ صداقت برتتا تو ربوبیت کے آثار اور مصنوعیت کے دلائل تجھ کو خود اپنے نفس میں موجود معلوم ہو جاتے اور خدائے تعالیٰ کے وجود کے شواہد و براہین صاف ظاہر ہوتے۔

دہریہ کی مفضل کو تنبیہ

دہریے نے کہا، میاں! اگر کچھ تم گفتگو کر سکتے ہو تو ہم تم سے کلام کریں۔ اگر تمہارے پاس کوئی قائم و ثابت دلیل ہو تو ہم اسے مان لیں گے اور اگر تم اہل کلام میں سے نہیں ہو تو تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر تم جعفرؑ بن محمدؐ الصادق کے اصحاب میں سے ہو تو ان کا طرز کلام تو ایسا نہیں ہوتا جیسی تم نے گفتگو کی اور نہ وہ اس طرح کی دلیل سے ہم سے بحث کرتے۔ انہوں نے ہماری باتیں اس سے زیادہ سنی ہیں جو تم نے سنیں۔ لیکن نہ تو

کبھی گفتگو میں فحش سے کام لیا اور نہ ہم پر جواب دینے میں تعدی وظلم کیا۔ اور وہ بہت ہی بردبار، باوقار، عقلمند اور پختہ عقل کے آدمی ہیں۔ نہ تو سختی کرتے ہیں، نہ ان کو طیش آتا ہے۔ ہماری گفتگو سنتے ہیں اور نہایت توجہ سے کان لگاتے ہیں، اور ہماری دلیلوں کو پوچھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم تمام اپنی دلیلیں بیان کر لیتے ہیں اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اب حضرت کو خاموش کر دیا تو اسی وقت ہماری حجت و دلیل کو ایک مختصر سے کلام اور معمولی سی دلیل سے باطل کر کے ہمارے اوپر حجت لازم فرماتے ہیں اور ہمارے عذر کو قطع کر دیتے ہیں اور پھر ہم حضرت کے جواب کو رد کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ اگر تم بھی ان کے اصحاب میں سے ہو تو ویسی ہی گفتگو کرو۔

مفضل امام جعفرؑ صادق کی خدمت میں

مفضل نے کہا کہ: یہ سن کر میں وہاں سے محزون ومتفکر نکلا کہ دیکھئے اسلام و اہل اسلام اس فرقے کے کفر کی وجہ سے کیسی بلا میں مبتلا ہوئے ہیں، کہ یہ خدا کو بالکل نہیں مانتے اور جہان کے معطل ہونے کے قائل ہیں۔ اور خدمت میں اپنے آقا صلواۃ اللہ علیہ کی حاضر ہوا۔ آپؑ نے جو مجھ کو شکستہ حال دیکھا تو فرمایا، تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے جو کچھ ان دہریوں کی باتیں سنی تھیں اور جس جس دلیل سے ان کے کلام کو رد کیا تھا عرض کر دیا۔

حضرتؑ نے فرمایا: میں تم کو باری تعالیٰ جل عزاسمہٗ کی وہ حکمتیں جو تمام عالم میں اور درندوں، بہائم، پرندوں، کیڑوں، مکوڑوں اور ہر قسم کے جانداروں خواہ حیوان ہوں یا نباتات اور اشجار ثمر دار ہوں یا بے ثمر اور ادنیٰ اور بقولات خوردنی وغیر خوردنی میں ہیں، ایسی بتاؤں گا جس سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کر سکیں اور مومنوں کے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور ملحدوں کو حیرت ہو جائے۔ تم میرے پاس کل صبح کے وقت آنا۔

مفضل نے کہا کہ میں یہ سن کر میں نہایت خوش وخرم حضرت کے حضور سے واپس آیا

اور انتظار کی وجہ سے وہ شب بہت ہی طولانی معلوم ہوئی، کیونکہ مجھے انتظار تھا کہ کسی طرح صبح ہو اور وہ باتیں حضرت سے حاصل کروں، جن کا آپ نے وعدہ فرمایا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حاضر خدمت ہوا اور اِذن طلب کرنے کے بعد حضوری سے مشرف ہو کر باادب سامنے کھڑا ہوا۔ آپؑ نے بیٹھ جانے کا حکم دیا، میں بیٹھ گیا۔ پھر آپؑ اُٹھ کر ایک حجرے کی طرف چلے جس میں اکثر بغرض تخلیہ تشریف رکھتے تھے، میں بھی ساتھ ہی اُٹھا، آپؑ نے فرمایا، چلے آؤ۔ میں پیچھے پیچھے چلا۔ آپؑ داخل حجرہ ہوئے۔ میں بھی داخل ہوا۔ آپؑ بیٹھ گئے۔ میں بھی سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا:

"مفضل! گویا میں تم کو دیکھ رہا تھا کہ اس شب گزشتہ میں انتظار کی وجہ سے تم کو کس قدر طولانی رات معلوم ہوئی۔"

میں نے عرض کی، ہاں مولا، ایسا ہی ہے۔

امام جعفرؑ صادق کا مفضل کو درس توحید

"مفضل! خداوند کریم موجود تھا اور کوئی چیز اس سے پہلے نہ تھی اور وہ باقی رہے گا اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ پس اُسی کے لیے حمد اس بات پر ہے کہ اس نے ہمیں الہام کیا اور اس کے لیے شکر ہے اس بات پر کہ اس نے ہم کو عطیہ دیا۔ اس نے ہمیں اعلیٰ علموں کے ساتھ خاص کیا اور روشن علوی مرتبہ کے ساتھ خصوصیت دی اور تمام خلق سے ہمیں اپنے علم کے ساتھ منتخب کیا اور ہمیں ان پر اپنی حکمتیں دے کر امین مقرر کیا۔"

مفضل نے کہا، مولا! کیا آپؑ اجازت دیتے ہیں کہ جو کچھ آپؑ بیان فرما رہے اسے میں لکھتا رہوں، اور میں اس وقت اپنے ساتھ سامان کتابت بھی لے کر آیا ہوں؟

امامؑ نے فرمایا: ہاں لکھ لو۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''اے مفضل! شک و شبہ والوں نے مخلوقات کی پیدائش کے اسباب اور اس کی باریکیوں کو نہ جانا اور ان کے فہم و ادراک، ان چیزوں کی حکمت اور درستی کے سمجھنے سے قاصر ہیں جو خالق عالم جل قدسہٗ نے اپنی طرح طرح کی مخلوقات خشکی و تری، ہموار و ناہموار زمینوں میں پیدا کی ہیں۔ وہ اپنے علم کے قصور کی وجہ سے منکر ہو گئے اور اپنی عقل کی کمزوری کے سبب جھٹلانے لگے، دشمنی پر آمادہ ہوئے، یہاں تک کہ اشیائے عالم کے پیدا کیے جانے ہی کے منکر ہو گئے اور اس امر کا دعویٰ کر دیا کہ یہ تمام چیزیں مہمل و معطل ہیں ان میں کسی کی صناعی نہیں اور نہ کسی مدبر و خالق کی طرف سے کوئی حکمت ہے اور نہ اس نے ان کو کسی مقدار معین پر پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے زیادہ برتر ہے جسے وہ بیان کرتے ہیں'' اللہ ان کو قتل کرے، کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی گمراہی اور اندھے پن (بے بصیرتی) اور حیرت میں اندھوں کی طرح ہیں جو کسی ایسے گھر میں داخل ہوئے ہوں جس کی بنیاد نہایت مستحکم اور خوبصورت قائم کی گئی ہو اور اس میں اچھے اچھے نفیس فرش بچھے ہوں اور قسم قسم کے کھانے پینے کی اشیاء اور لباس اور ضروری چیزیں اس میں مہیا کی گئی ہوں اور ہر شے درستی کے ساتھ اپنے موقع و محل پر حکمت و تدبیر اور اندازے کے ساتھ رکھی ہوئی ہو اور وہ اندھے اس مکان میں دائیں بائیں ہاتھ چلا رہے ہوں اور اس کے کمروں میں مارے مارے پھرتے ہوں، کبھی ان میں سے کوئی کسی چیز کو پا بھی جائے جو اپنے موقع پر رکھی ہوئی ہے اور ضرورت کے لیے مہیا کی گئی ہے اور وہ اس کی غرض کو نہ جانتا ہو کہ یہ اس جگہ کیوں رکھی ہوئی ہے اور کس لیے مہیا کی گئی ہے اور کس مطلب سے اس طرح بنائی گئی ہے، تو اس پر غصہ کرے اور ناراض ہو اور اس مکان کو اور اس کے بنانے والے کو بُرا بھلا کہنے لگے (حالانکہ دراصل یہ اس اندھے کی بینائی کا قصور ہے) یہی حال اس فرقے کا ہے جو معاملہ خلقت اور ثبوت صنعت

کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ جب ان کے ذہن ان اسباب اور علتوں کے سمجھنے سے قاصر رہے جو ان اشیاء میں ہیں تو تمام جہان میں حیران و سرگردان پھرنے لگے اور حسن صنعت اور کمال خلقت اور ان کے مہیا کرنے کی خوبی کو نہ سمجھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی چیز سے کوئی واقف ہوتا ہے اور اس کے سبب کو نہیں جانتا اور نہ اس کی غرض و احتیاج کو سمجھتا ہو، تو فوراً اس کی مذمت کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے یہ محال ہے اور محض غلط ہے۔ جیسے مانویہ (مجوسیوں کا ایک فرقہ) مانی نامی ایک شخص کی طرف منسوب ہے جس نے شاپور ابن اردشیر شاہ کے زمانے میں ایک دین و مذہب نیا نکالا تھا، اس کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰؑ تو نبی ہیں مگر جناب موسیٰؑ نبی نہ تھے اور تمام عالم کو دو چیزوں نے پیدا کیا ہے اچھی چیزوں کو تو نور نے پیدا کیا ہے اور درندے وغیرہ موذی چیزوں کو ظلمت نے پیدا کیا ہے۔ یہی دو خدا ہیں جو نفع و ضرر کی چیزوں کے خالق ہیں نے کیا اور نیز اس ملحد سرکش بدکار فرقے نے علانیہ طور پر کہنا شروع کیا ہے اور ان کے علاوہ گمراہوں نے بھی جنہوں نے صرف یہ کہہ دینے سے کہ فلاں چیز محال ہے ناممکن ہے اپنے تئیں خدا سے دور کر دیا ہے۔

پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی معرفت عنایت کی ہو اور اسے اپنے دین کی طرف ہدایت کی ہو اور مخلوقات کی کاری گری کی تدبیر پر غور کرنے اور اس لطیف اصلاح اور قائم دلیلوں کو عمدہ طور سے بیان کرنے پر جن خوبیوں سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، توفیق دی ہو تو اس پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو اس کا مولیٰ ہے اس توفیق عطا ہونے پر بہت حمد کرے اور اس سے اس بات کی خواہش کرے کہ وہ اسے اس معرفت و قوت بیان پر قائم رکھے اور زیادتی معرفت عطا کرے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ''اگر تم میرا شکریہ ادا کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔'' لَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ''اور اگر تم کفران نعمت کرو گے تو جان لو کہ میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

اے مفضل! اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے وجود پر پہلی عبرت اور دلیل تو یہی ہے کہ عالم کو کس صورت سے بنایا گیا ہے۔ اس کے اجزا کیوں کر ترکیب دیے گئے ہیں۔ کس خوبی سے اس کا نظم و انتظام کیا ہے۔ اگر تم اس جہان کو اپنے فکر سے تامل اور غور کرو اور اپنی عقل سے ہر ایک چیز کو جدا جدا کر کے سمجھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ عالم ایک ایسے مکان کے مانند ہے جس میں تمام وہ چیزیں موجود ہیں جن کی ضرورت بندوں کو واقع ہوتی ہے۔ دیکھو! آسمان تو چھت کے مانند ہے اور زمین ایسی بچھی ہوئی ہے جیسے فرش اور ستارے اس طرح لگے ہوئے ہیں جیسے مکان میں بہت سے چراغ رکھے ہوں اور اپنے اپنے موقع سے روشن ہوتے ہوں اور جواہر اس طرح مخزون ہیں جیسے مکان میں خزانے اور ذخیرے ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر شے اپنی اپنی ضرورت کے لیے تیار و موجود ہے۔ اور حضرت انسان اس جہان میں ایسے ہے جیسے اس مکان کا مالک اور آقا ہو جس کے قبضہ میں وہ تمام چیزیں ہیں جو اس مکان کے اندر ہیں۔ اور مختلف طرح کے نباتات۔ اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے موجود و مہیا ہیں (کوئی حیوانات کی غذا دہی کے لیے، کوئی انسان کی دوا کے لیے، کوئی محض زینت و آرائش کے لیے، کوئی انسان کو خوشبو پہنچانے اور اس کی تفریح کے لیے، کوئی حیوانات کی دوا کے لیے، کوئی انسانوں کی غذا رسانی کے لیے، کوئی صرف پرندوں کے لیے، کوئی صرف چرندوں کے لیے وغیرہ وغیرہ) اور قسم قسم کے حیوانات خاص خاص مصلحتوں اور منافع کے لیے صرف کیے گئے ہیں۔

اس حسن ترتیب و تالیف وجمع و توصیف میں صاف کھلی دلیل اس بات پر موجود ہے کہ تمام جہان کسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس نے ایک مقدار معین پر ان کو خلق کیا ان میں حکمتیں قرار دیں۔ ان میں انتظام قائم کیا، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے مناسبت اور تعلق قرار دیا۔ اور نیز اس بات پر بھی دلیل ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے جس نے ان کو اس خوبی سے جمع کیا ہے، ترکیب دی ہے، ایک کو دوسرے سے منضم کر دیا[1] ہے۔ (وہ جلیل ہے

---

[1] کیونکہ اگر کئی خالق ہوتے تو جہان کا یہ انتظام قائم نہ رہ سکتا اور اتنی مدت تک ایک ہی سلسلہ باقی نہ رہتا ضرور کچھ نہ کچھ جھگڑا فساد ہوتا اور جہان میں ابتری پھیلتی۔

قدوس ہے، بلندی والا ہے، اس کی ذات کریم ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں، ان منکروں کی باتوں سے کہیں برتر ہے)۔

انسان کی ابتدائی خلقت کی حکمتیں

اے مفضل! ہم اب تمہارے سامنے انسان کی خلقت کے بیان سے ابتدا کرتے ہیں اس سے عبرت حاصل کرو (دیکھو!) اس انسان کی خلقت کا پہلا مرتبہ (مرحلہ) تو وہ ہے جس سے رحم کے اندر جنین کی اصلاح وتدبیر کی جاتی ہے حالانکہ وہ تین قسم کے پردوں میں بند ہے اور تین قسم کی تاریکیوں میں ہے۔ ایک پیٹ کی تاریکی۔ دوسرے، رحم کا اندھیرا، تیسرے بچہ دان کی تاریکی۔ اور یہ ایسا وقت ہے کہ بچہ نہ تو اپنی غذا کے لیے کوئی تدبیر کرسکتا ہے اور نہ کسی طرح کی تکلیف کو اپنے سے ہٹا سکتا ہے اور نہ کوئی نفع اپنے لیے حاصل کرسکتا ہے اور نہ کسی ضرر کو دفع کرسکتا ہے۔ اس وقت خون حیض اس بچہ کی طرف جاری ہوتا ہے جو اسے غذا پہنچاتا ہے جیسے نباتات کو پانی غذا پہنچاتا ہے۔ اسی طرح پر وہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کی خلقت پوری نہیں ہو لیتی اور اس کے بدن کی جلد مضبوط نہیں ہوتی کہ ہوا کا مقابلہ کر سکے (یعنی ہوا سے اس کو تکلیف نہ پہنچ سکے) اور اس کی آنکھ اس قابل نہیں ہو جاتی کہ روشنی کو دیکھ سکے جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو اس کی ماں کو دردزہ شدت سے شروع ہوتا ہے اور اس کو بہت سخت متحرک اور بے چین کرتا ہے یہاں تک کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ خون جس سے اس کی غذا پیٹ کے اندر ہوتی تھی، ماں کے پستان کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تو اس کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے، رنگ بھی بدل جاتا ہے اور وہ کچھ اور ہی قسم کی غذا بن جاتا ہے۔ جو بچے کے مزاج کے نہایت ہی موافق ہوتا ہے بہ نسبت خون کے اور جس وقت اسے ضرورت ہوتی ہے اس وقت اس کو پہنچایا جاتا ہے۔ پس جس وقت وہ پیدا ہوتا ہے اسی وقت ہونٹوں پر زبان پھرانے لگتا ہے اور لبوں کو حرکت دیتا ہے۔ اس غرض سے کہ اسے دودھ پلایا

جائے۔ تو وہ اپنی ماں کے دونوں پستانوں کو ایسا پاتا ہے جیسے دو شربے اس کی خوراک کے لیے لٹکے ہوں ہیں۔ اسی حیثیت سے برابر دودھ سے غذا پاتا رہتا ہے جب تک اس کا بدن نرم اور اس کی آنتیں و اعضاء رقیق اور کمزور رہتے ہیں۔

دانتوں کی ضرورت اور حکمت

یہاں تک کہ چلنے پھرنے لگتا ہے اور اسے ایسی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جو سخت ہو، تاکہ اس کا بدن قوی ہو، اس میں طاقت آئے۔ تو اس وقت اس کے ڈاڑھ کے دانت نکلتے ہیں کہ ان سے غذا کی چیز کو چبا سکے تاکہ اس کا ہضم ہونا اس کے لیے آسان ہو جائے۔ پھر اسی طرح غذا کھاتا رہتا ہے۔

ڈاڑھی کی حکمت

یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے۔ اگر لڑکا ہوا تو اس کے چہرے پر بال نکلتے ہیں تاکہ مرد کی علامت اور مردوں کی عزت اس سے حاصل ہو، جس سے وہ بچپنے کی حد سے اور عورتوں کی مشابہت سے نکل جاتا ہے اور اگر لڑکی ہوئی تو اس کا چہرہ صاف و شفاف رہتا ہے اس پر بال نہیں نکلتے تاکہ تازگی اور حسن اس کا باقی رہے جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو اور بقائے نسل کا باعث ہو سکے۔

تفصیل بیان گزشتہ

اے مفضل! ان تمام مختلف حالتوں میں جس شان سے انسان کی تدبیر و اصلاح ہوتی رہی ہے کیا تم جان سکتے ہو کہ یونہی بغیر کسی مدبر اور خالق کے ہوتی رہی ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر یہ خون (خون حیض) اس وقت جبکہ وہ (بچہ) رحم میں تھا۔ اس کی طرف جاری نہ کیا جاتا، تو کیا وہ ان نباتات کی طرح خشک نہ ہو جاتا جن کو پانی نہیں ملتا۔ اور اگر درد زہ اسے متحرک نہ کرتا اور اس کے پیدا ہونے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کو نکلنے کی تحریک نہ کرتا تو کیا وہ رحم

میں اسی طرح نہ دفن ہو جاتا جیسے زندہ بچے زمین میں دفن کر دیے جاتے تھے۔ اور اگر ولادت کے وقت اس کے مزاج کے موافق دودھ نہ ملتا تو کیا بھوکا مر نہ جاتا۔ یا ایسی غذا نہ کھاتا جو اس کے موافق مزاج نہ ہو اور اس کے بدن کی اصلاح نہ کر سکے اور اگر اپنے وقت خاص پر اس کے دانت نہ نکلتے تو کیا اُس کو کھانے کی چیزیں کھانی اور چبانی اور ان کا ہضم کرنا دشوار نہ ہوتا۔ یا اسے اسی حالت رضاعت پر باقی نہ رکھتا تو پھر، نہ تو اس کا بدن مضبوط ہوتا اور نہ وہ کسی کام کے قابل بنتا، اور پھر تو اس کی ماں اسی کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہتی، کسی دوسرے بچے کی تربیت کی اس کو فرصت ہی نہ ملتی۔

اور اگر اس کے چہرے پر اپنے وقت سے بعد بال نہ نکلتے تو کیا بچوں ہی کی ہیئت اور عورتوں ہی کی صورت پر نہ رہ جاتا۔ پھر نہ تو اس میں کوئی جلالت ہوتی اور نہ وقار ہوتا (جیسے آپ خواجہ سراؤں کو دیکھتے ہیں، ڈاڑھی نہ ہونے کی وجہ سے کیا منڈی صورت معلوم ہوتی ہے)۔

مفضل نے عرض کی یا حضرت میں نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو اپنی حالت پر باقی رہ جاتے ہیں ان کے ڈاڑھی نہیں نکلتی اگر چہ وہ بوڑھے بھی ہو جائیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ تو ان کی کرنی کا نتیجہ ہے۔ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ پس سوائے اس شخص کے جس نے اس انسان کو پیدا کیا۔ جبکہ یہ معدوم تھا اور اس کے وجود کے بعد اس کے تمام مصالح کا خود کارکن بنا وہ کون ہے جو اس کے لیے منتظر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً اس کی ضروریات کو پورا کرتا رہتا ہے۔

اگر اہمال (بے کسی کے پیدا کیے ہوئے پیدا ہو جانا) ایسی ایسی تدبیروں کے ہوتے ہوئے بھی ہو سکتا، تو بالقصد پیدا کرنا اور باندازہ معین خلق کرنا غلطی اور محال سے بھی ہو سکتا، کیونکہ یہ دونوں اہمال کے مخالف ہیں حالانکہ ایسا کہنا نہایت ہی لغو ہے (کہ اصلاح و درستی تو

بغیر کسی خالق کے ہو جائے اور خرابی و نادرستی تدبیر و تقدیر خالق کے ہونے سے ہو سکے) اور اس کا کہنے والا جاہل ہے کیونکہ بغیر بنائے ہوئے کسی چیز کا پیدا ہو جانا کبھی ٹھیک اور درست نہ ہوگا اور خرابی و تضاد باہمی کبھی انتظام کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ملحدین جو کچھ کہتے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ بہت برتر ہے۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے کیوں ناسمجھ ہوتا ہے

پہلی حکمت:

اگر بچہ بافہم و عقل پیدا ہوتا تو وہ بالکل اس جہاں کو پہنچانتا ہی نہیں اور مدہوش و حیران رہ جاتا، جبکہ وہ ایسی چیزیں دیکھتا جن کو کبھی نہ دیکھا تھا اور اس کے سامنے وہ جہان کی مختلف طرح کی صورتیں بہائم و طیور وغیرہ کی آتیں جیسی اس نے کبھی نہ دیکھی تھیں اور اب جنہیں دم بدم اور روز بروز دیکھتا ہے۔

اے مفضل! اسے یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شخص کسی ایک ملک سے قید ہو کر دوسرے ملک میں جائے اور اس کی عقل بھی درست ہو تو دیکھو وہ کیسا حیران و پریشان ہوتا ہے۔ نہ تو جلد وہاں کی گفتگو سیکھ سکتا ہے اور نہ وہاں کے اخلاق و آداب کو قبول کر سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جو بچپنے ہی میں جبکہ اس کی عقل کامل نہ ہوئی ہو کسی غیر ملک میں قید کر کے پہنچایا جائے تو بہت جلد وہاں کی زبان، وہاں کے اخلاق و انداز سیکھ لے گا۔ اسی طرح، اگر بچہ باعقل و ہوش پیدا ہوتا اور یکا یک آنکھ کھولتے ہی اس جہان کی عجیب عجیب چیزیں اور مختلف طرح کی صورتیں اور قسم قسم کے اتفاق و اختلاف دیکھتا تو سخت تعجب میں رہتا اور مدت تک اس کی عقل میں یہ بات نہ آتی کہ میں کہاں تھا، کہاں آ گیا اور یہ جسے میں دیکھ رہا ہوں کیا ہے۔ خواب ہے یا بیداری کی حالت میں یہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں۔

دوسری حکمت

پھر اگر وہ باعقل و ادراک پیدا ہوتا تو جب اپنے تئیں دیکھتا کہ کوئی گود میں اٹھائے ہوئے ہے اس کو دودھ پلایا جاتا ہے اسے (بقاعدۂ عرب) کپڑے کی پٹیوں میں لپیٹا جاتا ہے، اسے گہوارہ میں لٹایا جاتا ہے، (کیونکہ بچوں کے لیے یہ سب باتیں ہونی ضروری ہیں، اس سبب سے ابھی اس کا بدن نرم ہے اور مرطوب ہے) تو اسے کیسی نفرت اور ذلت معلوم ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ باعقل و ہوش پیدا ہونے میں دلوں کو اس سے وہ حلاوت نہ ملتی اور نہ وہ وقعت اس کی لوگوں کو ہوتی جو عام طور پر ناداں بچوں کے کھلانے اُچھالنے سے ہوتی ہے اور ان کے بھولے پن کی وجہ سے دلوں کو ان کی طرف ایک خاص میلان اور رجحان ہوتا ہے۔

تیسری حکمت

لہٰذا وہ دنیا میں اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ کچھ سمجھتا نہیں ہوتا۔ بالکل دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اور تمام چیزوں کو اپنے نہایت کمزور ذہن اور ناقص معرفت سے دیکھتا ہے جس کی وجہ سے اسے کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔

پھر رفتہ رفتہ، وقتاً فوقتاً اس کی عقل اور معرفت بڑھتی رہتی ہے تاکہ وہ آہستہ آہستہ تمام چیزوں سے مانوس ہو جائے اور اس کے ذہن کو مشق حاصل ہو جائے اور پھر اس پر قائم رہے اور اسے غور کرنے کی ضرورت نہ پڑے، نہ اس کو حیرت ہو اور پھر باطمینان اپنی عقل و تدبیر سے معاش حاصل کر سکے۔ اس کی کوشش کر سکے اور عبرت حاصل کرنا اور فرمانبرداری اور بھول چوک اور نافرمانی کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

چوتھی حکمت

یہ کہ اگر بچہ باعقل و ادراک پیدا ہوتا اور خود اپنے کام کو سمجھ سکتا، تو اولاد کی پرورش کی

حلاوت کا محل نہ رہتا، اور وہ مصلحت جس سے والدین اپنی اولاد کے امور میں ہر وقت مصروف و مشغول رہتے ہیں فوت جاتی، اور نہ والدین کی ان پر وہ مہربانی اور عطوفت باقی رہتی جو عام بچوں کی ضرورتوں کے موقع پر ہوتی ہے جس سے وہ ان کے لیے تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔

پانچویں حکمت

یہ کہ نہ اولاد کو ماں باپ سے الفت پیدا ہوتی، اور نہ ماں باپ کو اولاد سے۔ اس لیے کہ جب وہ اپنی عقل کی وجہ سے والدین کی تربیت اور داشت سے مستغنی ہیں تو وہ ان سے وقت ولادت سے ہی الگ ہو جاتے، اولاد، ماں باپ سے اور ماں باپ، اولاد سے۔ پھر تو نہ کوئی شخص اپنی ماں کو پہنچانتا، نہ باپ کو اور نہ وہ اپنی ماں، بہن اور باقی محارم سے نکاح کرنے سے (صحبت کرنے سے) پرہیز کرتا، کیونکہ وہ ان کو پہچانتا ہی نہیں۔

چھٹی حکمت

اور کم از کم جو اس میں قباحت ہے حالانکہ وہ سب سے بڑی خرابی ہے اور نہایت مکروہ بات ہے اور وہ یہ کہ اگر بچہ باعقل و ادراک و باہوش و حواس، ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا اور وہ اس شے کو دیکھتا جسے دیکھنا اسے جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کچھ مناسب معلوم ہوتا کہ وہ اسے دیکھے تو اس کی کیا حالت ہوتی؟

اے مفضل! کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس خلقت کی ہر شے کس انتہائی درستی اور خوبی پر قائم کی گئی ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز اس میں کسی غلطی اور خطا سے خالی ہے۔

بچوں کے رونے کی حکمت

دیکھو اے مفضل! بچوں کے رونے میں کیا نفع اور فائدہ ہے۔ اس بات کو جانو کہ بچوں کے دماغ میں رطوبت ہوتی ہے، اگر وہ اس میں رہ جائے تو طرح طرح کی مصیبتیں ان پر پڑتیں اور عارضے ان کو لاحق ہوتے۔ مثلاً آنکھ ہی جاتی رہتی یا اور کوئی بیماری واقع ہو جاتی۔

لہٰذا رونا، اس رطوبت کو ان کے دماغوں سے بہا دیتا ہے اور اس کے بعد ان کے بدنوں میں صحت پیدا کر دیتا ہے اور ان کی آنکھوں میں سلامتی پیدا کر دیتا ہے۔

کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ بچہ تو رونے سے فائدہ پاتا ہے اور اس کے والدین اس بات کو نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے خاموش کریں اور اس کی خوشی کے موافق کام کرتے رہیں تاکہ وہ روئے نہیں، حالانکہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ رونا ہی اس کے لیے اچھا ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ بہت سی چیزوں میں ایسی منفعتیں ہوں جنہیں یہ دہریے نہ سمجھتے ہوں۔

اور اگر وہ ان باتوں کو سمجھتے تو صرف اپنی جہالت اور عدم علم کی وجہ سے کسی چیز کی نسبت یہ نہ کہتے کہ اس میں فائدہ نہیں کیونکہ جن باتوں کو یہ منکرین نہیں سمجھتے اسے اہل معرفت جانتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخلوق اس حکمت کو نہیں جانتی اور خالق اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

بچوں کی رال بہنے کی حکمت

بچوں کے منہ سے جو رال بہتی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ رطوبت نکلتی رہتی ہے جو اگر بدن میں رہ جائے تو بڑے بڑے امراض پیدا کر دے جیسے تم ان آدمیوں کو دیکھتے ہو جن کے مزاج میں رطوبت زیادہ ہے وہ احمق اور مجنون اور بے عقل ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت سے امراض ان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے فالج ہے، لقوہ ہے یا اس کے مانند اور امراض ہیں تو خدائے تعالیٰ نے یہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ رطوبت بچپنے ہی میں ان کے منہ کے ذریعے سے بہہ جائے جس سے ان کو بڑے ہونے کے بعد صحت رہے۔ یہ پروردگار نے ان کو ایسی چیز بخشی ہے جس کی حکمت سے یہ ناواقف ہیں اور ان چیزوں میں مہلت دی ہے جسے وہ نہیں جانتے (کہ شاید اب بھی معرفت حاصل کریں اور خدا شناس بنیں) اگر یہ لوگ اس کی

تمام نعمتوں کو جانتے ہوتے تو کبھی اتنی مدت تک معصیت میں نہ پڑے رہتے۔ پس اسی کے لیے تسبیح اور پاکی ہے۔ کس قدر اس کی نعمت بزرگ ہے اور جو اس کی مخلوقات میں سے اس کے مستحق ہیں یا نہیں مستحق ہیں ان سب پر کیسی کامل نعمت ہے، اور وہ اس سے زیادہ برتر ہے جسے یہ گمراہ کہتے ہیں۔

آلاتِ جماع کی ضرورت وحکمت

اے مفضل! اب ذرا غور کرو کہ جماع کے آلات نر و مادہ میں کیسے مناسب بنائے گئے ہیں۔ نر کے لیے تو ایسا آلہ بنایا ہے جو ابھر سکتا ہے اور بڑھ سکتا ہے تاکہ نطفہ رحم تک پہنچ سکے، کیونکہ اسے اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنا نطفہ کسی دوسری چیز میں ڈال سکے (اس لیے کہ نر سے تو بچہ ہو ہی نہیں سکتا لامحالہ اس کی ضرورت ہوئی کہ مادہ کے رحم تک نطفہ پہنچائے، تاکہ بچہ ہو سکے) اور مادہ کو ایک گہرا ظرف دیا گیا (یعنی رحم) جو دونوں (نر و مادہ) کے نطفوں کو اچھی طرح رکھ سکے اور بچے کا تحمل کرے اور اس کے لیے پھیلتا رہے (جس قدر بچہ بڑھتا رہتا ہے اسی قدر رحم پھیلتا جاتا ہے تاکہ بچے کو تنگی نہ ہو) اور اس کی حفاظت کرے کہ وہ قوی و مستحکم ہو جائے۔ کیا یہ بات کسی باریک بین حکیم کی تدبیر نہیں ہے؟ (اور کیا یہ سب حکمتیں خود بخود پیدا ہوگئی ہیں، اور یہ لطیف مناسبتیں بھی خود بخود ہوگئی ہیں؟)!! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور مشرکین کے شرک سے برتر ہے۔

جملہ اعضائے جسم کی کیا ضرورت ہے؟

اے مفضل! غور کرو، جسم کے اعضاء میں اور اس امر میں کہ ہر ایک ان میں کس ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے اور اس میں کیا اصلاح و تدبیر کی گئی ہے؟ دیکھو! دونوں ہاتھ تو کام کرنے کے لیے ہیں اور دونوں پاؤں چلنے کے لیے اور دونوں آنکھیں راہ دیکھنے کے لیے اور منہ غذا کھانے کے لیے، معدہ ہضم کے لیے اور جگر غذا کا لُب لباب نکال لینے کے لیے

(تا کہ اس سے خون صفرا، سودا اور بلغم بنا سکے اور تمام جسم کو تقسیم کرے) اور سوراخ اس لیے کہ ان میں سے فضلہ دفع ہو سکے، اور آنتیں...... ان کی متحمل رہنے کے لیے، اور فرج بقائے نسل کے لیے اور علیٰ ہذا القیاس تمام اعضاء ہیں کہ اگر ان میں غور کرو گے اور اپنی فکر سے کام لو گے تو ہر ایک عضو کو ایسا پاؤ گے کہ وہ کسی خاص کام کے لیے نہایت درستی اور حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے۔

طبیعت فاعل اور خالق عالم نہیں ہو سکتی

مفضل نے کہا میں نے عرض کی آقا! کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ سب باتیں طبیعت سے پیدا ہوئی ہیں اور دراصل یہ طبیعت کا فعل ہے۔ (یعنی جس طرح اس شے کی طبیعت مقتضی ہوتی ہے ویسے ہی اس کے آلات بن جاتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اچھا تو ان سے پوچھو کہ یہ طبیعت جس کے یہ افعال باحکمت و باتدبیر ہیں، آیا وہ علم اور قدرت بھی رکھتی ہے یا محض بے شعور و بے ادراک ہے۔ اس میں نہ قوت ہے نہ علم۔ اگر وہ یہ کہیں کہ اس میں علم اور قدرت ہے تو پھر انہیں خالق کے ماننے سے کیا چیز روکتی ہے؟ (اسی کو تو ہم خالق کہتے ہیں جو علم اور قدرت والا ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو کسی علم اور قدرت والے نے پیدا کیا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی خالق نہیں، تو جب طبیعت علم و قدرت والی ہوئی اور اس نے یہ فعل با حکمت و تدبیر کیے تو ان اشیاء کی پیدا کرنے والی ہوئی حالانکہ وہ پیدا کرنے والے کو مانتے ہی نہیں)۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ طبیعت بے علم و قدرت کے ایسی ایسی چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ (یعنی نہ وہ جانتی ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں اور نہ اسے اس کام کی قدرت ہے جسے وہ کر رہی ہے) اور اس کے کاموں میں اس قسم کی حکمت و تدبیر ہے جسے تم دیکھ رہے ہو (تو چونکہ یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ ایک شے کو کام کرنے کی قدرت بھی نہ ہو اور نہ اسے اس کام کا

ادراک ہو، پھر بھی وہ اس کو کرے)۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ فعل کسی حکیم پیدا کرنے والے کا ہے اور جسے یہ لوگ طبیعت کہتے ہیں وہ صرف اس کا بنایا ہوا ایک قاعدہ ہے جسے اس نے اپنی مخلوقات میں حکمت سے جاری کر دیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ہر چیز کو اس کے اسباب اور علت سے پیدا کرے۔ مثلاً پانی سے دانہ اگاتا ہے۔ اگر مینہ نہ برسے تو غلہ نہ پیدا ہو۔ مجامعت زن وشوہر سے بچہ پیدا کرتا ہے۔ اگر مرد وعورت ہم صحبت نہ ہوں اور نطفہ رحم تک نہ جائے تو بچہ نہیں ہو سکتا۔ بخارات سے ابر پیدا کرتا ہے اور ابر کو ہوا سے متحرک کرتا ہے تاکہ مینہ (بارش) برسے، اگر یہ نہ ہو تو بارش نہ ہو۔ یہ دہریے اس لیے یہ سمجھے کہ دراصل یہی اسباب وعلل اور طبیعت خالق ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اشیائے عالم کا خالق نہیں، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے کیونکہ صرف پانی جو بے روح ہے وہ کس طرح غلہ پیدا کر سکتا ہے جب تک اس میں کوئی اثر دینے والا اثر نہ پیدا کرے۔ اور نطفہ کیونکر بچہ پیدا کر سکتا ہے اگر کوئی حکیم مدبر اس میں یہ قوت پیدا نہ کرے کہ اس کے ایک حصے سے سر بنے اور ایک حصے سے پاؤں بنیں، ایک حصے سے ہڈیاں بنیں، ایک حصے سے قلب وجگر وغیرہ بن سکیں، صرف نطفہ جو ایک بے ادراک چیز ہے وہ کیا کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور چیزیں بھی ہیں۔

غذا خوری کے متعلق تدبیریں اور حکمتیں

اے مفضل! ذرا اس بات میں غور کرو کہ بدن کے اندر غذا کیونکر پہنچتی ہے اور اس میں کیا کیا حکمتیں اور تدابیر ہیں۔

دیکھو! کھانا جب معدے میں جاتا ہے تو معدہ اس کو پکاتا ہے اور اس کا لب لباب جگر کی طرف ان باریک رگوں کے ذریعے سے جو جگر کے اندر جالداری بنی ہوئی ہیں پھینک دیتا ہے (جسے اطباء کیموس کہتے ہیں) یہ معدہ مثل مصفی غذا کے بنایا گیا ہے کہ غذا کو صاف کر

کے جگر میں بھیجتا رہے تاکہ جگر میں کوئی ایسی چیز نہ پہنچ جائے جو اسے زخمی کر دے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ جگر ایک نرم چیز ہے سختی کا تحمل نہیں کر سکتا۔

پھر جگر اس غذائے حاصل شدہ اور لب لباب کو لے لیتا ہے تو وہ ایک نہایت ہی باریک حکمت سے خون بن جاتا ہے اور ان نالیوں (رگوں) کے ذریعے سے تمام بدن میں پہنچ جاتا ہے جو اس کام کے لیے بنائی گئی ہیں جیسے پانی کے لیے نالیاں بنائی جاتی ہیں کہ تمام زمین تک پہنچ جائے۔ (جہاں تک پہنچانا مقصود ہے جیسے آپ کھیتوں میں دیکھتے ہیں۔ باغوں میں کہ ادھر سے ادھر نالیاں بنی ہوئی ہیں اور انہیں چھوٹی چھوٹی نالیوں سے پانی تمام کھیت اور باغ میں پہنچتا ہے) اور فضلہ اور خبیث چیزیں ان مقامات کی طرف بہہ جاتی ہیں جو خاص انہیں فضلات کے جمع کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ (مثلاً مثانہ، امعا، بیخ ران، بغل وغیرہ)

پس جو کہ از قسم صفرا ہوتا ہے وہ تو پتے میں چلا جاتا ہے اور جو از قسم سودا ہوتا ہے وہ طحال کی طرف اور جو نمی اور تری ہوتی ہے وہ مثانے کی طرف بہہ جاتی ہے۔

پس، غور کرو اے مفضل! کہ ترکیب بدن میں کیا حکمت ہوتی ہے اور یہ اعضا کس طرح اپنے اپنے موقعوں پر قائم کیے گئے ہیں اور یہ ظروف (آنتیں اور مثانہ وغیرہ) کیوں کر تیار کیے گئے ہیں کہ فضلوں کو اپنے میں جمع کریں تاکہ تمام بدن میں یہ فضلے نہ پھیل سکیں۔ جس سے جسم میں بیماری اور لاغری پیدا ہو۔

پس مبارک ہے وہ ذات جس نے ایسے اچھے انداز ے اور محکم تدبیر سے ان اعضا کو پیدا کیا اور اسی کے لیے وہ حمد ہے جس کا وہ مستحق اور جس کے لائق ہے۔

مراتب نشو ونمائے جسم

مفضل نے کہا، میں نے عرض کی مجھ سے اب آپ بدن کا نشوونما جو وقتاً فوقتاً اس کے پورے اور کامل ہو جانے تک ہوتا رہتا ہے، بیان فرمایئے:

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: پہلا مرتبہ اس نشوونما کا وہ ہے جبکہ جنین کی صورت رحم میں بنتی ہے، ایسے وقت میں نہ اس کو آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کسی کا ہاتھ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور پھر اس کی تدبیر ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کامل آدمی بن کر اور تمام وہ اعضاء و جوارح و دل و جگر و امعاء و تمام کارکن اعضاء جو ترکیب بدن میں داخل ہیں مثلاً ہڈیاں، گوشت، چربی، مغز، پٹھے، رگیں اور غضاریف ان کو پورا اور کامل کیے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب اس عالم میں آتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ کیوں کر وہ مع اپنے تمام اعضاء کے نمو کرتا ہے اور بڑھتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی اس صورت اور ہیئت پر باقی رہتا ہے نہ کچھ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے (یعنی نہ اس کے اعضا میں انفصال ہوتا ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ اس میں کوئی جوڑ لگایا گیا یا گوشت کا پیوند کیا گیا اور نہ کوئی جزو زائد اس میں سے نکل جاتا ہے بلکہ بدن اسی طرح متصل رہتا ہے اور پھر اس میں نشوونما ہوتی رہتی ہے) یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی تک پہنچتا ہے خواہ اس کی عمر دراز ہو یا اپنی مدت عمر اس سے پہلے ہی پوری کر دے۔

کیا یہ نہایت باریک تدبیر اور حکمت نہیں ہے؟ (جسے کسی حکیم مدبر نے کمال حکمت سے کیا ہے)۔

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ

اے مفضل! غور کرو کہ انسان کو اس کی خلقت میں اور بہائم وغیرہ پر کیا فضیلت اور شرف دیا گیا ہے۔ یہ سیدھا اور کھڑا پیدا کیا ہے اور کیسا برابر ہو کر بیٹھتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تمام چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے لے سکے اور اپنے اعضا سے اسے حاصل کر سکے۔ کام کرنا اور تدبیر کرنا اسے ممکن ہو اگر جھکا ہوا اوندھا بنایا گیا ہوتا جیسے چوپائے ہیں تو کبھی اس سے وہ کام نہ ہو سکتے جواب کر سکتا ہے۔

غور کرو اے مفضل! ان حاسوں کی طرف جو خاص طور پر آدمی میں پیدا کیے گئے

ہیں، اور ان سے اسے شرافت دی گئی ہے اور دوسروں کو وہ شرف حاصل نہیں (یعنی یہ حاسے جس انداز اور جس ترکیب سے انسان میں ہیں باقی حیوانات میں نہیں ہیں بلکہ دیگر حیوانات کے حاسوں کی ساخت اور ترکیب دوسرے عنوان سے ہے۔)

آنکھیں سر میں کیوں بنائی گئیں؟

آنکھیں سر میں اس طرح بنائی گئی ہیں جیسے چراغ دان پر چراغ رکھا ہوتا ہے تاکہ ہر چیز کو دیکھ سکے۔ یہ آنکھیں سر کے نیچے کے اعضا میں نہیں بنائی گئیں۔ ہاتھوں میں آنکھ نہیں بنائی گئی۔ پاؤں میں نہیں بنا دی گئی جس سے اس کو آفتیں پیش آتیں اور کام کرنے اور حرکت سے وہ باتیں اس میں پیدا ہو جاتیں جو اسے بیمار کر دیں اور اس میں اثر کریں اور اسے نقصان پہنچائیں۔

وسط بدن میں آنکھیں نہیں بنائی گئیں جیسے پیٹ، پیٹھ، سینہ وغیرہ ہے کیونکہ اگر ان مقامات میں آنکھیں بنائی جاتیں تو انہیں گردش دینا اور چیزوں کو اُچک کر دیکھنا دشوار ہوتا تو جبکہ ان اعضاء میں سے کوئی عضو آنکھوں کے لیے مناسب نہ ہوا تو سر ہی اچھا مقام ان حواس کے لیے قرار پایا اور وہ ان حواس کے لیے بمنزلہ صومعہ کے بنایا گیا ہے۔

حاسّے پانچ کیوں بنائے گئے کم و بیش کیوں نہ ہوئے؟

پھر حواس (حاسّے) پانچ بنائے گئے تاکہ پانچ قسم کی چیزوں کو محسوس کرسکیں اور محسوسات میں سے کوئی چیز ایسی نہ رہے جسے وہ معلوم نہ کر سکے۔

آنکھیں تو اس لیے بنائی گئی ہیں کہ ہر طرح کے رنگ کو معلوم کر لیں پس اگر رنگ موجود ہوتے اور آنکھیں نہ ہوتیں جو انہیں محسوس کریں تو ان رنگوں کے موجود ہونے میں کوئی فائدہ نہ ہوتا (کیونکہ یہ رنگ صرف اس لیے ہیں کہ باہم اشیاء میں ان کی وجہ سے تمایز ہو اور یہ کہ آنکھوں کو ان سے تمیز حاصل ہو یا ان کو دیکھ کر فرحت حاصل کرسکیں۔)

کانوں کی ضرورت

اور کان اس لیے سر میں قرار دیے گئے ہیں کہ آوازوں کو محسوس کر سکیں۔ اگر آوازیں ہوتیں اور کان نہ ہوتے جو انہیں سمجھتے تو آوازیں بالکل بیکار ہوتیں۔

دیگر حاسوں کی احتیاج

علیٰ ہذا القیاس اور حاسوں کو سمجھ لیں۔ (مثلاً اگر ذائقہ کی چیزیں موجود ہوتیں اور قوت ذائقہ نہ ہوتی تو یہ تمام مزے بیکار ہوتے اور گرمی، سردی، نرمی، سختی مثلاً موجود ہوتیں اور حاسّہ لامسہ نہ ہوتا تو ان کا وجود بیکار ہوتا۔ اگر خوشبودار چیزیں موجود ہوتیں اور قوت شامّہ نہ ہوتی تو تمام خوشبوئیں فضول ہوتیں۔)

پھر اس کا عکس بھی اسی طرح ہے کہ اگر آنکھیں ہوں اور دنیا کے رنگ نہ ہوں تو آنکھیں بیکار ہیں، اور اگر کان موجود ہوں اور آوازیں نہ ہوں تو کان کا کوئی فائدہ نہیں۔

تو دیکھیں کہ کس طرح ایسا مقدر کر دیا ہے کہ ایک چیز دوسرے کو محسوس و معلوم کرے۔ اور ہر ایک حواس کے لیے ایک خاص محسوس مقرر کر دیا ہے جو اس میں اپنا عمل کرے اور ہر محسوس کے واسطے ایک حاسّہ بنا دیا ہے جو اسے محسوس کرے۔ (مثلاً آواز صرف کان ہی سے سنی جا سکتی ہے۔ آنکھ اسے محسوس نہیں کر سکتی۔ آنکھیں صرف رنگوں اور شکلوں کو دیکھ سکتی ہیں آوازوں کو نہیں سن سکتیں۔ ناک، خوشبو اور بدبو ہی کو محسوس کر سکتی ہے رنگ اور آواز کا ادراک نہیں کر سکتی اور علیٰ ہذا القیاس۔

حاسہ اور محسوسات کے درمیان واسطہ کیونکر قائم ہے؟

اور پھر کچھ چیزیں ان حواس اور محسوسات کے درمیان واسطہ بھی قرار دی گئی ہیں جن کے بغیر حاسہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مثلاً روشنی اور ہوا، کہ اگر روشنی نہ ہو جو رنگ کو آنکھوں کے سامنے ظاہر کر سکے تو آنکھیں کبھی رنگ کا احساس نہیں کر سکتیں۔ اور اگر ہوا نہ ہو جو آواز کو کانوں تک

پہنچاتی ہے تو کان کبھی آواز کا ادراک نہیں کر سکتے۔

تو کیا اے مفضل! جس شخص کی عقل صحیح ہو اور وہ اپنی فکر سے کام لے اس پر یہ بات چھپی رہ سکتی ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے بیان کیا، کہ حواس اس لیے بنائے گئے اور محسوسات اس طور پر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں اور ان کے واسطے کچھ چیزیں واسطہ بھی قرار دی گئیں جن سے حواس کا عمل پورا ہوتا ہے۔ بغیر کسی باخبر باریک (لطیف) بنانے والے کی تدبیر اور قصد کے بن گئے، اور اس میں کسی خالق کا کچھ اثر نہیں ہے۔ (کہیں خود بخود ایسے مناسبات اور ایسی حکمتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بھلا طبیعت کیا سمجھ سکتی ہے کہ آنکھ اس طرح بنائی جائے اور کان اس طرح اور فلاں چیز فلاں سے محسوس کرے، اور فلاں چیز فلاں کو، اور یہ بغیر واسطہ اور ذریعے کے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا واسطے بھی پیدا کر دیے۔ کہیں طبیعت لاشعوریہ سے یہ بات ممکن ہے؟ جب تک کوئی حکیم، مدبر ان باتوں کو نہایت حکم و مصلحت کے ساتھ سمجھ کر نہ بنائے۔

اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو کیا کیا نقصان پہنچتے

غور کرو اے مفضل! اس شخص کے حال پر جس کی آنکھیں نہیں ہوتیں تو اس کے کاموں میں کیا خلل پڑتے ہیں۔ نہ تو وہ اپنے پاؤں رکھنے کی جگہ کو دیکھ سکتا ہے (کہ کہاں قدم پڑا کہاں نہیں، بلندی ہے یا پستی، گڑھا ہے یا غار، وغیرہ وغیرہ) اور نہ اپنے سامنے کی چیزوں کو دیکھ سکتا ہے اور نہ وہ رنگوں کو دیکھ سکتا ہے اور نہ اچھی بری شکل کو۔ اگر کوئی گڑھا سامنے آ جائے تو اسے نہیں دکھائی دیتا۔ یا اگر کوئی دشمن تلوار لے کر اس کی طرف بڑھے تو اسے نہیں معلوم ہوتا اور نہ اس کو تحریر، تجارت اور زیور سازی وغیرہ صنعتوں کے کام کی راہ معلوم ہوتی ہے۔ (کہ کیونکر ان کاموں کو کرے) یہاں تک کہ اگر اس کا ذہن (اور دماغ) کام نہ کرے تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک پتھر پڑا ہوا ہے (البتہ اس کا ذہن کچھ اسے راہیں بتاتا ہے جس سے بغیر آنکھ کے

بھی چل پھر اور کھا، پی سکتا ہے)۔

کان نہ ہوں تو کیا خرابی ہوگی؟

علیٰ ہذا القیاس، جس کے کان نہ ہوں تو اس کے بہت سے کاموں میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس کو گفتگو و کلام کا ذائقہ ہی نہیں ملتا، اور نہ دردناک یا طرب انگیز آوازوں کی لذت اسے محسوس ہوتی ہے، اور لوگوں کو اس سے کلام کرنے میں سخت دِقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے تنگ آ جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی خبریں اور باتیں ہی نہیں سن سکتا، حالانکہ وہ موجود اور زندہ ہے، جیسے کوئی غائب آدمی خبروں سے ناواقف ہوتا ہے۔ یا جیسے کوئی مردہ ہے کہ لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا۔

عقل کا فائدہ

لیکن جس کی عقل ہی نہ ہو وہ تو بہائم کے مانند ہے بلکہ یہ شخص بہت سی ایسی چیزیں نہیں سمجھ سکے گا جنہیں بہائم سمجھتے اور جان سکتے ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ اعضاء و جوارح اور عقل اور تمام وہ چیزیں جن سے انسان کی اصلاح ہے اور جو ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو کتنا بڑا خلل اور ضرر اس کو پہنچے، کس طرح اس کی خلقت کو کامل بناتی ہیں اور کوئی ان میں سے کسی کامل مجسم انسان سے مفقود نہیں ہوتی تو کیا یہ سب چیزیں بے علم وقدرت و بے اندازہ پیدا ہوگئیں۔ (ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ ضرور کسی مدبر نے علم و اندازہ کے ساتھ ان کو بنایا ہے)۔

بعض لوگوں کی اعضاء و جوارح سے محرومی کی وجہ

مفضل نے کہا کہ:...... میں نے عرض کی تو پھر بعض آدمیوں میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ان کے بعض اعضاء و جوارح نہیں ہوتے اور ان کو اس سے وہی نقصانات پہنچتے ہیں جنہیں آپؑ نے بیان فرمایا ہے:

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ اس شخص کی تادیب وتنبیہ کے لیے ہے جس میں ایسا ہوتا ہے اور نیز غیروں کی تنبیہ ونصیحت کے لیے، جیسے بادشاہ لوگوں کو سزا دہی اور نصیحت کی غرض سے تنبیہ کرتا ہے اور یہ تنبیہ ان کی بُری بھی نہیں سمجھی جاتی (کیونکہ اگر سزا دہی کا قانون اٹھا دیا جائے تو خلقت سرکش ہو جائے) بلکہ ان کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کی اس تدبیر کو ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔

پھر جن لوگوں پر یہ بلا پڑتی ہے انہیں مرنے کے بعد اس قدر ثواب ملے گا (بشرطیکہ وہ خدا کا شکر کرتے رہیں اور اس کی طرف رجوع کریں) کہ جس کے سامنے وہ تمام مصیبتیں جو ان اعضاء کے نہ ہونے کی وجہ سے ان پر پڑی ہیں حقیر معلوم ہوں گی، یہاں تک کہ اگر ان کو مرنے کے بعد اختیار دیا جائے تو وہ اس بات کو پسند کریں گے انہیں بلاؤں میں لوٹا دیا جائے تا کہ زیادہ ثواب پائیں۔

سر ایک ہی کیوں پیدا کیا گیا ہے؟

غور کرو اے مفضل! ان اعضاء و جوارح میں جو ایک ایک پیدا کیے گئے ہیں اور دو دو۔ اور دیکھو کہ اس میں حکمت کیا ہے اور کیا انداز ہے اور کیا درستی تدبیر ہے۔

دیکھو! سر ان اعضا ان میں سے ہے جو ایک ہی پیدا کیا گیا ہے اور انسان کے لیے ہرگز مناسب بھی نہیں تھا کہ اس کے دو یا زیادہ سر بنائے جاتے۔

کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اگر ایک سر کے ساتھ دوسرا سر اور لگا دیا جاتا تو اس پر ایک بوجھ ہو جاتا، حالانکہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ تمام حاسے جن کی ضرورت انسان کو ہے وہ سب کے سب ایک ہی سر میں موجود ہیں۔

پھر اگر دو سر ہوتے تو ایک آدمی کے دو حصے ہو جاتے۔ پس اگر وہ ایک ہی سے گفتگو وغیرہ کرتا تو دوسرا محض بیکار ہوتا جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر دونوں کے ساتھ ایک ہی قسم

کی گفتگو کرتا تو ایک فضول تھا۔ (کیونکہ دونوں سے وہی بات حاصل ہوتی، جو ایک ہی سے ممکن تھی۔ پھر دوسرے سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت رہی، محض فضول ہوا۔) اور اگر ایک سے کچھ گفتگو کرتا (مثلاً) اور دوسرے سے کچھ، تو سننے والا یہی نہ سمجھ سکتا کہ کس کی بات قابل قبول ہے اور کسی کی نہیں۔ اسی طرح کے اور خلط مبحث واقع ہوتے۔

ہاتھ دو کیوں بنائے گئے؟

اور ہاتھ دو کیوں پیدا کیے گئے؟ انسان کے لیے ہرگز بہتر نہ ہوتا۔ اگر اس کے ایک ہی ہاتھ بنایا جاتا، کیونکہ یہ اس کے ان کاموں میں خلل انداز ہوتا جنہیں وہ کرتا ہے اور جن کی اسے ضرورت ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر بڑھئی اور معمار کا ایک ہاتھ شل ہو جائے تو وہ اس بات پر قادر نہ ہوگا کہ اپنے پیشے کو کر سکے؟ اور اگر یہ تکلیف کرے گا بھی تو اسے اچھی طرح مضبوطی کے ساتھ نہ کر سکے گا اور وہ کام ویسا نہ ہوگا کہ جیسا دونوں ہاتھوں سے ہو سکتا، جو اسے اس کام میں مدد دیتے ہیں۔

آواز اور اس کے آلات

اے مفضل! ذرا سوچو! انسان کی آواز اور کلام اس کے آلات کی ساخت کو اور اس معاملہ میں غور کرو۔ دیکھو حنجرہ (جس کی مدد سے آواز پیدا ہوتی ہے) تو ایک نلکی کے مشابہ ہے۔ جس سے آواز نکلتی ہے اور زبان، ہونٹ اور دانت حرفوں اور آوازوں کے ڈھالنے کا سانچا ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس کے دانت گر جاتے ہیں تو اس سے ''س'' نہیں ادا ہو سکتا، اور جس کے ''ہونٹ'' کٹ جائیں، اس کی زبان سے ''ف'' نہیں نکلتی، اور جس کی زبان موٹی ہو، اس سے ''ر'' نہیں ادا ہوتی، اور بڑا مزمار (جس کو غالباً بین باجا کہتے ہیں) اس سے بہت

ہی مشابہ ہے حنجرہ تو مزمار کی نلی سے مشابہ ہے اور پھیپھڑا، اس تونبی کے مشابہ ہے جس کے اندر پھونکتے ہیں، تاکہ ہوا بھرے اور عضلات جو پھیپھڑے کو پکڑے ہوئے ہیں تاکہ آواز نکل سکے وہ ان انگلیوں کے مانند ہے جن سے تونبی کو دباتے ہیں تاکہ ہوا نلی میں آئے اور ہونٹ اور دانت جو حروف اور راگ کو صحیح طریقے سے نکالتے ہیں وہ ان انگلیوں سے مشابہ ہیں جو مزمار کے منہ میں آتی جاتی ہیں جس سے صفیریں اور راگ پیدا ہوں۔ البتہ یہ بات ہے کہ اگرچہ مخرج آواز کو مزمار سے سمجھاتے ہیں اور تعلیم کے موقع پر مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے۔ (یعنی میں نے مخرج صوت کو مزمار سے تشبیہ دی ہے) لیکن دراصل مزمار مشبہ ہے اور مخرج صورت مشبہ بہ ہے جس کے اندر اور ڈھنگ پر یہ باجا بنایا گیا ہے۔ نہ یہ کہ مزمار باجے کو دیکھ کر مخرج صوت بنایا گیا ہے۔

اے مفضل! میں نے تمہارے سامنے جن آلات و اعضائے کلام کو بیان کیا ہے وہ گفتگو اور کلام کے پیدا کرنے اور حرفوں کے درست نکالنے کے لیے کافی ہیں۔

مگر ان میں علاوہ اس میرے بیان کے اور بھی اغراض ہیں۔ مثلاً حنجرہ۔

حنجرہ کیوں پیدا ہوا؟

حنجرہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی راہ سے لطیف ہوا پھیپھڑے تک پہنچ سکے اور دل کو متواتر اور پے در پے آنے والے سانس سے آرام دے جو اگر ایک دم کے لیے بھی ٹھہر جائے تو فوراً انسان مر جائے۔

زبان کیوں پیدا کی گئی؟

اور زبان اس لیے بنائی گئی ہے کہ کھانوں کا ذائقہ معلوم ہو سکے اور ان میں تمیز کر سکے ہر ایک ذائقے کو جدا جدا سمجھ سکے۔ میٹھے کو کھٹے سے الگ کر سکے اور خالص ترش کو کھٹے میٹھے سے اور نمکین کو شیریں اور اچھے کو بُرے سے تمیز کرے۔

علاوہ اس کے زبان کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے کھانے اور پانی کے خوشگوار معلوم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

دانت کیوں پیدا کیے گئے؟

دانت غذا کو چباتے ہیں تا کہ وہ نرم ہو جائے اور اس کا ہضم ہونا آسان ہو اور علاوہ بریں دانتوں کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ ہونٹوں کی روک (سہارا) ہیں اور منہ کے اندر ہونٹوں کے چلے جانے کو روکتے ہیں۔

اسے یوں سمجھو کہ تم دیکھتے ہو جس کے دانت گر گئے ہیں ان کے ہونٹ کیسے ڈھیلے ڈھالے اور متحرک ہوتے ہیں۔

ہونٹوں کی حکمت

ہونٹوں کے ذریعے سے انسان پانی کو چوس سکتا ہے تا کہ جو پانی پیٹ کے اندر جائے وہ باندازۂ معین اور بالقصد جائے نہ کہ غرغراتا ہوا بہتا ہوا جائے۔ جس سے پینے والے کے گلے میں پھندا نہ لگے اور زور سے بہہ کر جانے کے سبب سے کسی اندرونی حصہ میں خراش نہ پڑ جائے۔

پھر علاوہ اس کے یہ دونوں ہونٹ دروازہ کے مشابہ ہیں جو منہ کو ڈھانکے رہتے ہیں جب آدمی چاہے بند کرے۔

اے مفضل! ہم نے تم سے یہ بات بیان کر دی کہ ان اعضاء میں کئی طرح کے فوائد ہیں اور کئی کئی کاموں میں صرف ہوتے ہیں۔ جیسے ایک ہی آلے سے بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں مثلاً گینتی، جس سے زمین بھی کھودی جا سکتی ہے اور پتھر بھی توڑا جا سکتا ہے اور ہتھوڑا، جس سے کیل بھی ٹھونکی جا سکتی ہے اور لوہے کو بھی کوٹ کر باریک بنایا جا سکتا ہے وغیرہ۔

دماغی حکمتیں

اگر تم دماغ کو دیکھو تو ایسا پاؤ گے کہ تہہ بہ تہہ بہت سی جھلیوں میں لپٹا ہوا ہے تا کہ اسے آفتوں سے بچایا جا سکے اور متحرک نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے اوپر ایک کھوپڑی پاؤ گے جو بمنزلہ خود کے ہے تا کہ ٹھیس اور دھکے کا صدمہ اسے چورا چورا نہ کر دے جو اکثر سر پر واقع ہوتا ہے۔

سر کے بالوں کی حکمت

پھر کھوپڑی کو ایسا پاؤ گے کہ اسے بالوں کا لباس پہنایا گیا ہے جو سر کے لیے بمنزلہ پوستین کے ہو گیا ہے اور اسے گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔

پس سوائے خالق کے کس نے دماغ میں یہ استحکام دیا اور حفاظت پیدا کی اور کس نے اس کو احساس کا سرچشمہ بنایا، اور کس نے اسے اس قابل کیا کہ اس کی حد سے زیادہ حفاظت کی جائے بہ نسبت باقی بدن کے اس کا مرتبہ زیادہ ہونے اور اس کا رتبہ بڑا ہونے اور اس کا درجہ بلند ہونے کے سبب سے اس کی پوری حفاظت ونگہداشت کی جائے۔

آنکھ کے پپوٹے اور پلکیں

اے مفضل! آنکھوں کے پپوٹوں پر غور کرو کہ کس طرح یہ آنکھوں کے لیے مثل پردوں کے بنائے گئے ہیں اور پلکیں مثل ان ڈوروں کے بنائی گئی ہیں جنہیں پکڑ کر پردے کو اٹھاتے اور چھوڑتے ہیں۔

اور دیکھو! کہ آنکھ کو کس طرح اس گڑھے کے اندر رکھا ہے اور اس پر اس پردے اور بالوں سے سایہ کیا ہے۔

دل کو سینے میں کیوں رکھا؟

اے مفضل! یہ کس نے دل کو سینے کے اندر چھپایا ہے اور اسے وہ چادر اڑھائی جسے تم

جھلی کہہ سکتے ہو اور کس نے اس کی حفاظت پسلیوں اور اس گوشت اور پٹھوں کے ذریعے سے جو اس کے اوپر ہیں، کی ہے تاکہ اس تک کوئی ایسی چیز نہ پہنچے جو اس میں خراش پیدا کردے یہ کس نے حلق کے اندر دو سوراخ اس لیے بنائے کہ ایک سے تو آواز نکلے اور یہ وہ سوراخ ہے جو پھیپھڑے سے قریب ہے اور دوسرے سے جسے مرے کہتے ہیں اور وہ معدے سے متصل ہے، غذا اندر جا سکے۔

اور کس نے آواز والے سوراخ کو ایک ڈھکنے سے ڈھانکا ہے جو کھانے کو پھیپھڑے تک پہنچنے سے روکتا ہے ورنہ آدمی مر جائے۔

یہ کس نے پھیپھڑے کو دل کا پنکھا بنایا ہے جو نہ کبھی تھکتا ہے اور نہ اپنے کام میں خلل کرتا ہے تاکہ دل میں حرارت جمع نہ ہو جائے جو اس کی ہلاکت کا باعث ہو۔

یہ کس نے پیشاب پاخانے کے سوراخوں میں ایسی ڈوریاں لگائی ہیں جو ان دونوں کو روکے اور سمیٹے ہوئے رہیں۔ (جیسے کپڑے کے بٹوے میں ڈوری ہوتی ہے کہ جب چاہیں کھول لیں اور جب چاہیں بند کر دیں) تاکہ ہمیشہ بہتے ہی نہ رہیں اور اس سے انسان کی زندگی تلخ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں شمار کرنے والا شمار کر سکتا ہے۔ بلکہ جو باتیں احصاء و شمار میں نہیں آتیں اور جنہیں آدمی نہیں جانتے وہ اس سے زیادہ ہیں جنہیں وہ جانتے ہیں۔

یہ کس نے معدے کو سخت پٹھوں والا بنایا ہے اور سخت کھانے کے ہضم کے لیے اس کو معین کر دیا ہے۔

جگر نرم و رقیق کیوں بنایا؟

اور یہ کس نے جگر کو رقیق اور نرم پیدا کیا کہ لطیف اور صاف شدہ غذا کو قبول کر سکے اور ہضم کرے اور معدے کے فعل سے زیادہ لطیف فعل کر سکے۔

کیا یہ سب کام سوائے خدائے قادر مطلق کے اور کوئی کر سکتا ہے؟ کیا یہ تمہارا خیال ہے کہ اہمال و تعطیل بھی ایسا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!! بلکہ یہ ایک مدبر، حکیم اور قادر کی تدبیر ہے جو تمام چیزوں کو ان کے پیدا کرنے سے پہلے جانتا ہو، جو کسی کام میں عاجز نہ ہو، اور وہ اللہ لطیف و خبیر ہے۔

مختلف اعضاء کی خلقت کی وجوہات

اے مفضل! غور کرو کہ یہ رقیق مغز ہڈیوں کی نلیوں میں کیوں بحفاظت رکھے گئے ہیں؟ اسی لیے تاکہ نلیاں ان کی حفاظت کر سکیں اور اسے ضائع ہونے سے بچائیں (ورنہ اگر نلیوں میں نہ رکھا جاتا تو دھوپ اور حرارت آتش سے پگھل کر بہہ جاتا۔ سردی میں نہایت ٹھوس اور سخت ہو جاتا جس سے انسان زندہ نہ رہ سکتا) کیونکہ ہڈیوں کے مغز بھی باعث قوت بدن انسان ہیں۔

اور یہ بہنے والا خون کیوں رگوں میں بند کیا گیا ہے۔ جیسے پانی ظرف میں رکھا جاتا ہے۔ صرف اسی لیے تاکہ رگیں اس کو روکے رکھیں اور وہ بہہ جانے نہ پائے۔

یہ ناخن انگلیوں پر کیوں قرار دیے گئے ہیں۔ اسی لیے تاکہ ان کو صدمے سے محفوظ رکھیں اور کام کرنے میں مدد دیں (اگر انگلیوں پر ناخن نہ ہوتے صرف گوشت ہی گوشت ہوتا تو چٹکی سے کسی چیز کا گرفت کرنا یا اٹھانا سخت دشوار ہوتا۔ قلم کے ذریعے سے لکھنا دشوار ہوتا، سوئی پرونا ناممکن ہوتا (یعنی سوئی میں دھاگہ پرونا دشوار ہو جاتا)۔

یہ کان کا اندرونی حصہ قید خانے کی طرح کیوں ٹیڑھا میڑھا بنایا گیا ہے؟ اسی لیے تاکہ اس میں آواز جاری ہو سکے اور اس پردے تک پہنچ جائے جس سے آواز سنائی دیتی ہے اور نیز اس لیے کہ ہوا کی تیزی کا زور ٹوٹ جائے تاکہ پردۂ سماعت میں خراش نہ ڈالے۔

یہ آدمی کی رانوں اور سُرین پر گوشت کیوں چڑھایا گیا ہے؟ اسی لیے تاکہ اسے

زمین کی تکلیف سے بچائے اور سُرین پر بیٹھنے سے اس کو تکلیف نہ ہو، جیسے اس شخص کو بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے جس کا جسم دبلا اور گوشت کم ہو گیا ہو، اور اس کے اور زمین کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل نہ ہو جو زمین کی سختی سے اس کو بچائے (مثلاً گدہ، مسند وغیرہ)۔

انسان کی دو قسمیں مرد اور عورت کیوں ہیں؟

کس نے انسان کو مرد اور عورت بنا کر پیدا کیا؟ اسی نے نا، جس نے اس کو نسل بڑھانے والا بنایا (کیونکہ ان دونوں مختلف صنفوں کا وجود صرف اس لیے ہے کہ ان کے اجتماع وصحبت سے نسل انسانی بڑھتی رہے اور قائم رہے)۔ اور کس نے اس کو نسل بڑھانے والا بنایا ہے؟ اسی نے نا، جس نے اس کو امید والا پیدا کیا، (کیونکہ انسان اپنی نسل کے قائم رہنے کی صرف اسی لیے کوشش کرتا ہے کہ اس کا نام باقی رہے ورنہ اگر یہ خیال نہ ہوتا اور انسان کے دل میں یہ آرزو نہ ہوتی تو کیوں ایک دوسرے سے ہم صحبت ہوتا۔

دیکھو ان جانوروں کو جن کی نسل کی بقا صحبت و جماع پر موقوف نہیں ہے بلکہ مادہ کے جمع ہونے اور اس میں ایک خاص قوت پہنچ جانے سے پیدائش واقع ہوتی ہے۔ ان میں نر و مادہ کا تمائز بالکل نہیں ہوتا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ زنبور، مثلاً کون سی مادہ ہے اور کون سا نر ہے؟

انسان کو کام کے آلات کیوں دیے گئے؟

اور کس نے اسے کام کے آلات دیے؟ اسی نے نا، جس نے اس کو کام کرنے والا بنایا اور کس نے اس کو کام کرنے والا بنایا؟ اسی نے نا، جس نے اس کو صاحب احتیاج پیدا کیا۔ (اگر آدمی کو کسی چیز کی احتیاج نہ ہوتی تو کبھی کوئی کام نہ کرتا، اگر اسے پیٹ بھرنے کی احتیاج نہ ہوتی تو مزدوری کیوں کرتا، حرفت و صنعت کیوں کرتا، اگر اسے جسم کو گرمی اور سردی سے بچانے کی ضرورت نہ ہوتی تو کپڑے کیوں سیتا، سوئی کیوں بناتا، ڈورے کیوں درست کرتا، کپڑے کیوں بُنتا، روئی کیوں کاتتا، کپاس کیوں بوتا، اور جب یہ نہ ہوتا تو آلات عمل، ہاتھ،

پاؤں، انگلیاں وغیرہ بھی بیکار تھیں) اور کس نے اسے صاحب احتیاج پیدا کیا۔ اسی نے نا، جس نے اس کے لیے احتیاج کے اسباب پیدا کیے اور کس نے اس کے لیے احتیاج کے اسباب پیدا کیے، اسی نے نا، جس نے اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری لی۔ (غور سے اس مضمون کو پڑھیں)۔

انسان کو فہم کیوں دی گئی؟

کس نے اس کو بافہم بنایا؟ اسی نے نا، جس نے اس کے لیے جزا و سزا بھی لازم کی (کیونکہ اگر جزا و سزا اس پر لازم نہ کی جاتی تو اس میں سمجھ و فہم ہونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے سے پہلے اس کے پیدا کرنے والے نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے متعلق سزا و جزا کی جائے گی۔ لہٰذا اس کو عقل اور سمجھ بھی دی، تاکہ نیک و بد کو سمجھ سکے اور نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی قرار پائے۔

دیکھو جن مخلوقات کے لیے سزا و جزا نہیں قرار دی گئی ہے۔ ان کو کسی نیک و بد کا احساس ہی نہیں ہے اور نہ وہ جانتے ہیں کہ یہ فعل حرام ہے، نہ وہ جانتے ہیں کہ یہ حلال ہے اور نہ انہیں مکروہ کی تمیز ہے نہ انہیں واجب کا علم ہے۔ سوائے اس کے کہ جس چیز کی ضرورت ان کے بقائے صنف یا بقائے شخص میں ہے اس کو البتہ پہچانتے اور جانتے ہیں۔ مثلاً پرندہ اس قدر ضرور سمجھ رکھتا ہے کہ باز اس کو شکار کرے گا۔ لہٰذا، اس کی صورت دیکھتے ہی تیز پروازی سے کام لیتا ہے۔ یا ایک ہرن، مثلاً خوب جانتا ہے کہ شیر اسے پھاڑ کھائے گا۔ لہٰذا اس کی شکل ہی دیکھ کر فرار ہو جاتا ہے)۔

انسان کو تدبیر کرنی کس نے بتائی؟

کس نے اس کو حیلہ و تدبیر عنایت کی؟ اسی نے نا، جس نے اسے قوت بخشی اور کس نے اسے قوت دی۔ اسی نے نا، جس نے اس پر حجت لازم کی (اگر اتمام حجت نہ مقصود ہوتا تو

قوت دینے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ اب البتہ یہ بات پوچھی جاسکتی ہے کہ ہم نے تو تم کو اٹھنے بیٹھنے کی قوت دے دی تھی پھر تم نے مثلاً نماز کیوں نہ پڑھی یا تمہارے ہاتھ پاؤں میں طاقت دے دی تھی تم نے فلاں گرتے ہوئے آدمی کو دوڑ کر کیوں نہ بچایا۔ ان کاموں میں کون اس کی مدد کرتا ہے جن میں اس کی تدبیر کچھ کارگر نہیں ہوتی، وہی نا، جس کا انتہائے شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ (سبحان اللہ کس انداز کا کلام ہے اور کیا لطیف تعلیم ہے۔ اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ)

مفضل غور کرو اور سوچو جو کچھ میں نے تم سے بیان کیا ہے۔ کیا بغیر بنائے بن جاتے ہیں یہ نظم ونسق اور یہ ترتیب ہوسکتی ہے (ہرگز نہیں) تعالی اللہ عما یصفون (اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ برتر ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں)۔

دل کی حکمتیں

اے مفضل! اب میں تم سے کچھ دل کا حال بیان کرتا ہوں، جان لو کہ اس میں بہت سے سوراخ (باریک مسامات) ان سوراخوں کے سامنے ہیں جو پھیپھڑے میں واقع ہیں جو کہ دل کا پنکھا ہے۔ (دل کی گرمی اور بخارات کو دور کرتا رہتا اور اسے آرام دیتا رہتا ہے) اگر یہ سوراخ ہٹ جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہ رہیں تو کبھی ہوا دل میں نہ پہنچ سکے اور انسان مرجائے۔ کیا کسی باعقل وہوش آدمی کی عقل اجازت دے سکتی ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرے کہ یہ ترکیب بغیر بنائے خود بخود بن گئی، اور کیا اس کا دل اسے اس بات کے کہنے سے نہ روکے گا؟ (یا اس کا نفس اس بات کی گواہی نہ دے گا کہ ایسا کہنا بے عقلی کی بات ہے۔)

اے مفضل! اگر تم دروازے کے دو کواڑوں میں سے ایک کو دیکھو جس میں کنڈا لگا ہو تو کیا تم کو یہ خیال ہوگا کہ یہ یوں ہی بنایا گیا ہے؟ بلکہ تم یقیناً اس بات کو جان لوگے کہ وہ بنایا ہوا ہے اور کسی دوسرے کواڑ سے ملایا جائے گا.................. تاکہ ان دونوں کے اجتماع سے کسی

قسم کا فائدہ ہو۔

اسی طرح تم نر حیوان کو پاؤ گے کہ وہ کسی جوڑے کا ایک فرد ہے جو مادہ کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ دونوں ہم صحبت ہوں اس لیے کہ اس میں بقائے نسل ہے (اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے مدبر حکیم نے نہایت دانائی سے سمجھ کر کہ مرد کو مردانہ آلات دیے جائیں اور عورت کو زنانہ، تاکہ دونوں کے اجتماع سے بقائے نسل رہے ورنہ صرف مادہ میں یہ تمیز کہاں تھی کہ ایسا سمجھ کر مرد اور عورت علیحدہ علیحدہ بناتا اور ہر ایک کے لیے اس کے مناسب آلات پیدا کرتا۔)

پس اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے جو فلسفی بننے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر کیوں کر ان کے دل اس عجیب و غریب خلقت اور ساخت کے دیکھنے سے اندھے ہو گئے ہیں جس سے انہوں نے انکار کر دیا، کہ خلقت عالم میں کسی مدبر کی تدبیر ہی نہیں اور کسی ارادے والے کا ارادہ ہی نہیں (بلکہ جہان آپ سے آپ پیدا ہو گیا ہے۔)

دیکھو! اگر مرد کا عضو تناسل مسترخی ہوتا تو کیوں کر رحم کے قعر تک پہنچ سکتا، اور کیوں کر اس میں نطفہ ڈال سکتا۔ اور اگر ہمیشہ ایستادہ ہی رہتا تو آدمی کیسے بچھونے پر کروٹ لیتا اور مجمع میں کیوں کر چل سکتا، جبکہ ایک چیز اس کے آگے تنی ہوئی کھڑی رہتی۔ (تو معلوم ہوا کہ کسی حکیم نے خاص حکمت سے اس عضو کو ایسا پیدا کیا ہے کہ صرف ضرورت کے وقت تو ایستادہ ہو ورنہ باقی اوقات میں سست رہے تاکہ مذکورہ بالا فوائد حاصل ہو سکیں۔)

پھر علاوہ بدہیت اور بدنما ہونے کے اس میں ایک خرابی یہ بھی ہوتی کہ ہر وقت مرد، عورت کی شہوت میں تحریک پیدا ہوتی رہتی۔ تو اللہ جل اسمہ نے ایسا بنا دیا کہ اس کا زیادہ حصہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے نہ رہے اور نہ مرد کو اس میں کچھ زحمت ہو۔ بلکہ صرف ضرورت کے وقت اس میں سیدھے کھڑے ہو جانے کی قوت دی گئی کیونکہ یہ مقدر کر دیا گیا ہے کہ اس میں نسل کا دوام و بقا ہے۔

اے مفضل! ذرا عبرت کی نظر سے دیکھو کہ انسان کے کھانے پینے اور اس کی تکلیف کے بآسانی رفع ہو جانے میں کتنی بڑی نعمت پروردگار عالم کی ہے۔ کیا کسی مکان کے بنانے میں یہ خوبی انداز نہیں ہے کہ بیت الخلاء ایسے مقام پر بنایا جائے جو محفوظ جگہ ہو؟ تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس سوراخ کو جو خلا (رفع حاجت) کے واسطے انسان کے لیے بنایا ہے وہ بھی اس کے ایسے مقام پر قرار دیا ہے جو بہت ہی پوشیدہ ہے اسے کھلا ہوا اور ظاہر اس کے پیچھے نہیں بنایا اور نہ ابھرا ہوا، اس کے سامنے، بلکہ وہ بدن کے ایک پوشیدہ حصے میں مخفی و مستتر اور باپردہ واقع ہے جس پر دونوں رانیں ملی ہوئی ہیں اور دونوں سرین اپنے گوشت سے اسے چھپائے ہوئے ہیں۔ جب آدمی کو رفع حاجت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس خاص نشست سے بیٹھتا ہے تو اس کا وہ منفذ جاری ہوتا ہے اور ثقل کے دفع کے لیے تیار ہو جاتا ہے (ورنہ بند رہتا ہے)۔

فتبارک اللہ من ظاهرت الائه و لا تحصی نعمائه

ڈاڑھ کے دانتوں کی حکمت

اے مفضل! ان ڈاڑھ کے دانتوں پر غور کرو جو آدمی کے منہ میں بنائے گئے ہیں۔ بعضے تو تیز ہیں جو غذا اور طعام کے کاٹنے اور کترنے کا کام دیتے ہیں اور بعضے چوڑے ہیں جو چبانے اور ریزہ ریزہ کرنے کا کام دیتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے دانتوں کی چونکہ اسے ضرورت تھی لہٰذا اس میں کمی نہیں کی گئی۔ (کیا طبیعت لاشعور یہ بھی یہ بات سمجھ سکتی ہے کہ آدمی کے واسطے ایسی ضرورت پڑے گی، لہٰذا اس کے لیے ایسے دانت بنانے چاہئیں۔ کیا اس میں یہ ادراک و تمیز ہے؟)

بالوں اور ناخنوں کی حکمتیں

غور کرو اور سمجھو کہ بالوں اور ناخنوں کا مونڈنا اور کاٹنا کیوں بہتر ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟ چونکہ یہ دونوں بڑھتے اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں اس لیے ضرورت پڑی کہ اس

کے اوپر اوپر کے حصے میں تخفیف کی جائے۔ لہٰذا یہ بے حس بنائے گئے تا کہ آدمی کو ان کے کٹوانے میں تکلیف نہ ہو اور اگر بال اور ناخنوں کے کترنے میں تکلیف محسوس ہوتی تو آدمی دو قسم کی زحمتوں کے درمیان پھنس جاتا، یا تو چھوڑ دیتا کہ بڑھا کریں، تو حد سے زیادہ بڑھ جاتے اور اسے بار معلوم ہوتا، یا کٹواتا تو اسے تکلیف محسوس ہوتی۔

مفضل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی تو ایسے کیوں نہ بنائے گئے کہ بڑھتے ہی نہیں، کہ انسان کو اس کے کٹانے کی ضرورت پڑے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندوں پر اس امر میں بہت سی نعمتیں ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے، اگر جانتے تو اس پر خدا کا شکریہ ادا کرتے۔

معلوم کرو کہ بدن کے امراض وتکالیف انہیں بالوں کے ذریعے سے دفع ہوتے ہیں جو اپنے مسامات سے نکلتے ہیں (بخارات اور پسینے انہی مسامات سے نکلتے ہیں، خود یہ بال بھی وہی بخارات ہیں جو تحت الجلد محتبس ہوتے ہیں) اور انگلیوں کے امراض ان ناخنوں کے ذریعے سے دفع ہوتے ہیں اسی لیے تو نورہ لگانے، سر منڈانے، ناخن ترشوانے کا ہر ہفتہ میں حکم دیا گیا ہے۔ تا کہ بال اور ناخن جلد جلد نکلیں اور بیماریاں ان کے نکلنے سے دفع ہوں، اور جب یہ بڑھ جاتے ہیں تو امراض وآلام متحیر رہ جاتے ہیں اور کم نکلتے ہیں تو بیماریاں بدن میں محتبس ہو جاتی ہیں اور وہ طرح طرح کے درد اور امراض پیدا کرتی ہیں۔

اور باوجود اس کے ان مقامات میں بال نہ اگنے دیے جہاں انسان کو نقصان پہنچتا۔ اگر آنکھوں کے اندر بال اگتے تو کیا وہ اندھا نہ ہو جاتا؟ اور اگر منہ کے اندر بال نکلتے تو کیا اس کے کھانے پینے میں لقمہ اور پانی نہ رکتا۔ اگر ہتھیلیوں میں بال پیدا ہوتے تو کیا اس کی قوت لامسہ کو نہ روکتے، اور کیا اچھی طرح چھو کر دریافت کرنے سے باز نہ رکھتے، اور بعض کاموں میں خلل انداز نہ ہوتے؟ اور اگر عورت کی فرج میں بال اگتے یا مرد کے عضو تناسل پر،

تو کیا ان کی لذت مجامعت کو نہ کھو دیتے؟

تو دیکھو! کہ کیوں کر ان مقامات میں بال نہ پیدا ہوئے کیونکہ اس میں مصلحت تھی۔ (کیا طبیعت بھی ان حکمتوں کو سمجھ سکتی ہے یا اس طرح کے افعال با حکمت طبیعت کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں؟ افسوس! ان دہریوں پر اور ان کی ناسمجھی پر)...... پھر یہ بات کچھ انسان ہی میں خاص نہیں، بلکہ بہائم اور درندوں اور تمام ان جانوروں میں بھی ایسا ہی پاؤ گے جن کی نسل کا بڑھنا صحبت و جماع پر موقوف ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ان کے تمام جسم تو بالوں سے ڈھانکے ہوئے ہوتے ہیں اور خاص یہ مقامات اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اس میں بھی تو یہی سبب ہے پس غور کرو اس خلقت کے معاملے کو دیکھو کہ کس کس طرح غلطی اور ضرر کے طریقوں سے بچایا ہے اور کس کس طرح ٹھیک درست اور با نفع پیدا کیا ہے؟

ان مانویوں (مانوی ایک فرقہ ہے مجوسیوں کا، جو حکیم مانی کی طرف منسوب ہے) اور ان کے امثال نے جب یہ کوشش کی کہ پیدائش (عالم میں) اور بقصد و ارادہ پیدا ہونے میں عیب نکالیں تو انہوں نے یہ عیب نکالا کہ پیڑو پر اور بغلوں کے نیچے بال کیوں پیدا ہوئے، اور اس بات کو نہ سمجھے کہ یہ اس رطوبت کی وجہ سے ہے جو ان مقامات کی طرف بہہ کر آتی ہے۔ اس سبب سے وہاں بال پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے پانی کے جمع ہونے کے مقامات میں گھاس پیدا ہو جاتی ہے کیا تم ان مقامات کو نہیں دیکھتے بہ نسبت اور مقامات کے کہ کس قدر ان فضلات کے جمع کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور انہیں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ (یعنی کس قدر پیڑو کے نیچے رطوبات جمع رہتی ہیں؟)

پھر ان میں یہ بھی حکمت ہے کہ جہاں آدمی کو اپنے بدن کے متعلق کچھ مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، ان مشقتوں میں سے ایک یہ بھی قرار دی گئی ہے کیونکہ اس میں مصلحت ہے اس لیے کہ جتنی دیر وہ اپنے بدن کی صفائی اور بالوں کے دور کرنے میں مصروف رہے گا،

اتنی ہی دیر اپنے حرص و ظلم اور نخوت (اشر) اور بیہودگی سے بچا رہے گا اور ان امور کا اس کو موقع نہ ملے گا۔

لعاب دہن کی حکمت

اے مفضل! غور کرو لعاب دہن (تھوک) کو اور دیکھو کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ یہ ایسا بنایا گیا ہے کہ ہر وقت منہ کے اندر جاری رہتا ہے تاکہ حلق اور تالو کو تر رکھے کہ یہ خشک نہ ہونے پائیں، کیونکہ اگر تالو اور منہ خشک رہتے تو آدمی مر جاتا اور پھر یہ بھی ہوتا کہ کھانا بھی نہ کھا سکتا جبکہ منہ میں وہ رطوبت ہی نہ ہوتی جو اسے اندر کی طرف لے جائے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر مشاہدہ خود گواہ ہے اور جانو کہ رطوبت غذا کا مرکب ہے اور کبھی یہی رطوبت دہن پتے پر بھی بہہ کر جاتی ہے اور اگر پتہ خشک ہو جاتا تو آدمی مر جاتا۔

پیٹ بند کیوں بنایا گیا؟

چند جاہل متکلمین اور کم عقل فلسفہ کے مدعیوں نے اپنی کم فہمی اور قصور علم سے یہ کہہ دیا کہ اگر آدمی کا پیٹ ایسا بنایا جاتا جیسے قبا ہوتی ہے کہ جب طبیعت چاہتا کھولتا اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے دیکھ لیتا اور اپنا ہاتھ اس میں ڈال سکتا، اور جب مرض کا علاج کرتا تو یہ اس سے بہتر ہوتا کہ بند رہے اور نگاہوں اور ہاتھ سے مخفی بنایا گیا ہے۔ اب جو اس کے اندر بیماری ہے اس کا حال باریک علامتوں سے معلوم ہوتا ہے مثلاً قارورہ دیکھنا، نبض پر ہاتھ رکھنا یا ایسی ہی اور باتیں جن میں اکثر غلطی اور شبہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات یہ غلطی نبض و قارورہ شناسی میں موت کا باعث ہو جاتی۔

کاش یہ جاہل مدعیان فلسفہ و کلام یہ جانتے کہ اگر ایسا ہوتا تو آدمی کو موت اور بیماری کا ڈر ہی نہ رہتا۔ (جہاں کچھ بیماری ہوئی فوراً پیٹ کو کھول کر دیکھ لیا اور جو کچھ اس میں سبب مرض ہے اسے نکال کر دور کر دیا کیونکہ وہ قبا کے پردوں کی طرح تو بنا ہی ہوا ہے۔) اور انسان

کو اپنی بقا اور عدم موت کا خیال ہونے لگتا اور اپنی سلامتی پر مغرور ہو جاتا اور اس کی وجہ سے اس میں سرکشی اور نخوت پیدا ہو جاتی۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ پیٹ کے اندر کی رطوبت ٹپکتی اور بہتی رہتی تو آدمی کی نشست گاہ، خواب گاہ، نفیس کپڑے اور زینت کے لباس سب خراب ہوتے رہتے۔ بلکہ اس صورت میں اس کا عیش تنگ ہو جاتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ معدہ اور جگر اور دل جو اپنا اپنا فعل انجام دیتے ہیں تو صرف اس حرارت غریزیہ کے سبب سے، جسے اللہ تعالیٰ نے پیٹ کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ پس اگر پیٹ میں کھلنے کے در ہوتے جس سے نظر اور ہاتھ اس کے علاج کے لیے اندر جا سکتے تو ہوا کی برودت پیٹ کے اندر پہنچ جاتی اور حرارت غریزیہ سے مخلوط ہو جاتی تو باطنی اعضاء کا عمل بھی بگڑ جاتا پھر تو آدمی مر ہی جاتا۔

کیا نہیں دیکھتے ہو (اے مفضل) کہ اصل خلقت اور اصل ساخت کے علاوہ جو خیالات پیدا ہوتے ہیں محض غلط اور فاسد ہوتے ہیں۔

کھانے سونے اور جماع کے متعلق امور حکمت

غور کرو اے مفضل! انسان کے کھانے اور سونے اور جماع کے معاملے میں جو اس کے لیے جو امور مقرر کیے گئے ہیں اور جو ان میں حکمتیں صرف کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کے واسطے ایک محرک بنایا گیا ہے جو اس کی خواہش کرے اور اسے ابھارے۔ پس بھوک کھانے کی مقتضی ہوتی ہے جس سے بدن اور قوام بدن کی حیات و زندگی ہے اور نیند کی کیفیت سونے کی مقتضی ہوتی ہے جس سے بدن کو راحت ملتی ہے اور قویٰ کی تھکن دور ہوتی ہے اور اگر آدمی صرف اس وجہ سے کھانا کھایا کرتا، کہ اس کے بدن کو اس کی ضرورت ہے، اور خود اس کی طبیعت کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہوتی جو اسے کھانا کھانے پر مجبور کرتی تو ممکن تھا کہ کسی کسی

وقت اس میں سستی بھی کرتا، کاہلی یا ثقل کی وجہ سے۔ تو اس کا بدن لاغر ہو جاتا اور وہ مرجاتا جیسے کسی شخص کوکسی دوا کی صرف اس وجہ سے ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے اپنے بدن کی اصلاح کرے مگر وہ اس کو ٹالتا رہتا ہے (کیونکہ طبیعت کی طرف سے کوئی قوی درخواست نہیں ہے۔) یہاں تک کہ یہ ٹالتے رہنا ہی بیماری اور موت کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر صرف اس سبب سے اور یہ سمجھ کر اسے اپنے بدن کو راحت دینے کی ضرورت ہے اور اپنے قویٰ کی تھکن مٹانی ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس میں کاہلی کرتا اور اسے روکتا تو آخر اس کا بدن دبلا ہو جاتا۔

اور اگر جماع صرف اس وجہ سے کرتا کہ اسے اولاد کی خواہش ہے (اور اس میں طبعی شہوت اور جوش نہ ہوتا) تو بالکل بعید نہ تھا کہ وہ اس میں سستی کرتا۔ آخر نسل کم ہو جاتی یا بالکل جاتی رہتی کیونکہ اکثر ایسے بھی آدمی ہیں جن کو اولاد کی خواہش نہیں ہے اور نہ اس کی پروا ہے۔ تو دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک فعل کے واسطے جس میں انسان کی تندرستی اور اصلاح ہے کس طرح اس کی طبیعت کے اندر ایک محرک پیدا کیا گیا جو اسے اس کی طرف آمادہ کرے اور اس کا محرک بنے۔

بدن کی چار قوتوں کا بیان

اور جان لو کہ آدمی کے جسم میں چار قوتیں ہیں۔

۱۔ جاذبہ ہے جو غذا کو قبول کرتی ہے اور اسے معدہ میں لے جاتی ہے۔

۲۔ مُمسکہ (ماسکہ) ہے جو غذا کو روکتی ہے تاکہ طبیعت اس میں اپنا فعل کرے (فعل انجام دے)۔

۳۔ ہاضمہ ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو اسے پکاتی ہے اور اس کا لب لباب نکال لیتی اور بدن میں اس کو پھیلاتی ہے۔

۴۔ دافعہ ہے۔ جو اسے دفع کرتی ہے اور بچے ہوئے ثقل کو گراتی ہے جبکہ قوت ہاضمہ اپنی ضرورت پوری کر چکی ہے۔

لہٰذا غور کرو کہ ان چاروں قوتوں میں جو بدن کے اندر ہیں کیا اندازہ قائم کیا گیا ہے اور چونکہ ان کی ضرورت تھی تو کس طرح بنائی گئیں اور ان میں کیا کیا حکمتیں اور تدابیر ہیں۔ (اگر ان چاروں قوتوں میں کسی ایک کی کمی ہوتی تو انتظام بدن میں خلل پڑ جاتا۔ آخر کو اسے موت آ جاتی) اگر قوت جاذبہ نہ ہوتی تو آدمی اس غذا کی تلاش کے واسطے جس میں اس کے بدن کا قوام و قیام ہے کیوں کر کوشش کرتا، اور اگر ماسکہ نہ ہوتی تو پیٹ کے اندر کیوں کر کھانا ٹھہر سکتا کہ معدہ اسے ہضم کرے۔ اور اگر ہاضمہ نہ ہوتی تو کیوں کر پکتا، اور کیوں کر وہ لب لباب نکلتا جو بدن کی غذا بن سکے اور اس میں خلل نہ پڑنے دے اور اگر دافعہ نہ ہوتی، تو وہ ثقل جسے ہاضمہ نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ دفع ہوتا اور یکے بعد دیگرے کس طرح نکلتا؟

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح پروردگار سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی لطیف کاریگری اور حسن تقدیر سے ان قویٰ کو بدن اور ان کاموں پر جن میں اس کی درستی ہے معین اور موکل کیا ہے۔ اس کی ایک مثال تم سے بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بدن کو تو سمجھو کہ ایک بادشاہ کا مکان ہے اور اس کے حشم و خدم اور بچے اس مکان میں ہیں اور کچھ خادمین ہیں جن کے حوالے اس کا انتظام ہے۔ ایک کا تو یہ کام ہے کہ وہ اس حشم و خدم کی ضرورتوں کو لا کر پہنچائے اور ان کے پاس رکھے اور دوسرے کا یہ کام ہے کہ جو کچھ آیا ہے اس کو لے اور جمع کرے، تاکہ اس کی اصلاح کی جائے اور قابل خوراک بنایا جائے۔ اور تیسرے کا یہ کام ہے کہ اس کو درست کرے اور تیار کرے اور ہر ایک کو تقسیم کرے۔ چوتھے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ گھر میں اس غلے وغیرہ کی وجہ سے کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا ہے اس کو مکان سے باہر پھینک دے۔

پس بادشاہ اس مکان کا تو خلاق حکیم ہے جو تمام عالم کا مالک ہے اور مکان، یہ بدن

ہے اور حشم وخدم اعضاء ہیں اور نوکر چاکر یہی چاروں قوتیں ہیں۔

اے مفضل! شاید تم میرے اس بیان کو جو قوائے اربعہ اور ان کے افعال کی نسبت کیا، زائد اور بیکار خیال کرو، حالانکہ یہ میرا بیان اس نہج پر نہیں ہے جو اطباء کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے اور نہ میری گفتگو اس معاملے میں ان کی گفتگو کی طرح ہے کیونکہ ان لوگوں نے تو ان قوائے اربعہ کا ذکر اس بنیاد پر کیا ہے کہ فن طب اور بدنوں کے صحیح رکھنے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ہم نے اس رخ سے بیان کیا ہے کہ جس کی ضرورت دین کی اصلاح اور گمراہوں کے نفسوں کو کجی سے شفا دہی میں ہے۔ جیسے وہ میرا شافی بیان اور مثل جس میں میں نے تدبیر و حکمت کو واضح کر دیا ہے۔

حواسِ خمسہ کا بیان اور ان کی حکمتیں

غور کرو اے مفضل! ان قویٰ کی بابت جو نفس انسان میں قرار دیے گئے ہیں اور وہ اس میں کس طرح واقع ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ فکر، وہم، عقل اور حافظہ وغیرہ قویٰ میں غور کرو۔ دیکھو! کہ اگر ان میں سے صرف قوت حافظہ ہی آدمی میں نہ ہو تو اس کا کیا حال ہو گا، اور کس قدر خلل اس کے کاموں میں اور امور معاش وتجارت میں پڑے گا جبکہ اسے یہی یاد نہ ہو گا کہ اس کا دوسروں پر کیا آتا ہے اور اس پر دوسروں کا کیا آتا ہے۔ کیا لیا تھا؟ کیا دیا تھا؟ کیا سنا تھا؟ کیا کہا تھا؟ اس سے کیا کہا گیا تھا؟ اور یہ بھی نہ یاد رہے گا، کہ کس نے اس پر احسان کیا تھا؟ اور کس نے برائی کی؟ کس چیز نے نفع پہنچایا تھا اور کس چیز نے نقصان؟

پھر اگر وہ کسی راہ میں بیشمار مرتبہ بھی چلتا تو بھی وہ راہ اسے یاد نہ رہتی۔ (کیونکہ اس کے دماغ میں قوت حافظہ ہی نہیں ہے) وہ اگر پڑھتا کسی علم کو تو تمام عمر یاد نہ کر سکتا، اور نہ کسی دین اور مذہب پر اپنا اعتقاد جما سکتا، نہ کسی تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا، اور نہ کسی گزشتہ چیز پر کسی موجودہ چیز کو قیاس کر سکتا۔ (کیونکہ اسے یاد ہی نہیں کہ میں نے پہلے کیا دیکھا تھا) بلکہ وہ تو اس

قابل ہوتا کہ انسانیت سے بالکل باہر سمجھا جائے۔

تو اے مفضل دیکھو! کہ یہ قوی آدمی کے لیے کیسی بڑی نعمت ہیں؟ سب کو چھوڑ کر صرف ایک ہی کو دیکھو تو اس کا کیا حال اور کیا مرتبہ ہے (کہ اگر یہ ایک حافظہ آدمی میں نہ ہو تو سینکڑوں خرابیاں اس کے کام میں حائل ہوں اور آخر زندگی سے تنگ آ جائے)۔

نسیان کی حکمت

حافظے سے بڑھ کر آدمی کو جو نعمت ملی ہے وہ تو نسیان (بھول) ہے۔ اگر نسیان نہ ہوتا تو آدمی کسی مصیبت میں تسلی ہی نہیں پا سکتا تھا اور نہ کبھی اس کی حسرت تمام ہو سکتی تھی، اور نہ کبھی اس کے دل سے کینہ نکل سکتا تھا۔ (یہی نسیان تو ہے کہ جب انسان کو عارض ہوتا ہے تو وہ اپنی مصیبت گزشتہ کو بھول جاتا ہے۔ کسی شے کی حسرت کو بھول جاتا ہے۔ کینہ کو بھول جاتا ہے اور میل جول پیدا کر لیتا ہے) اور نہ اشیائے دنیا میں سے کسی چیز سے فائدہ اور ذائقہ اٹھا سکتا جبکہ اس کو اپنی مصیبتیں یاد آتی رہتیں۔ نہ اس کو بادشاہ کی غفلت اور اپنے حاسد کے حسد سے سست پڑ جانے کی امید رہتی (اسے ہر وقت خیال رہتا کہ میں نے بادشاہ کا فلاں گناہ کیا ہے اسے یاد تو ضرور ہی ہو گا۔ اب وہ مواخذہ کرے گا اور اس خیال میں اس کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ علیٰ ہٰذا القیاس، حاسد کے حسد کے خیال سے جو اس کو تکلیف پہنچتی رہتی وہ بھی اس کو تلخ عیش کرتی رہتی)۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی میں یہ دونوں قوتیں، حافظہ اور نسیان کیسی متضاد پیدا کی گئی ہیں، اور ہر ایک کے لیے ایک خاص مصلحت قرار دی گئی ہے۔ (کیا بغیر کسی حکیم کے فعل کے ایسی حکمتیں ظہور میں آ سکتی ہیں؟)

اور جو لوگ کہ تمام اشیائے عالم کے دو متضاد خالق مانتے ہیں (جیسے مانویہ) بالکل امید نہیں کہ وہ ان دو متضاد چیزوں کا خالق بھی انہیں دو متضاد خالق کو مانیں۔ کیونکہ ان دونوں

متضاد قوتوں میں وہ مصلحتیں ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو (حالانکہ ان کے نزدیک شر کے خالق سے سوائے شرارت اور بدی کے کچھ پیدا نہیں ہو سکتا اور یہاں دونوں متضاد قوتوں میں نفع ہی نفع ہے۔ تو کیوں کہ شر والا خالق ان میں سے کسی ایک کو پیدا کر سکتا۔)

مفضل! غور کرو اس صفت پر جو خاص آدمی ہی کو دی گئی ہے، اور اس کے ساتھ کوئی اور ان تمام مخلوق حیوانات میں سے اس کا شریک نہیں ہے وہ کیا ہے؟ وہ شرم ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو کبھی کوئی شخص مہمان کی مہمانداری نہ کرتا، کوئی شخص اپنا وعدہ نہ پورا کرتا، اور نہ کسی کی ضرورت پوری ہوتی، اور نہ نیکی حاصل کی جاتی، اور نہ بدی سے پرہیز کیا جاتا، یہاں تک کہ ایسے بہت سے امور واجبہ ہیں جو صرف حیا و شرم کی وجہ سے بجا لائے جاتے ہیں کیونکہ جس نے حیا چھوڑ دی، وہ نہ تو والدین کے حق کی رعایت کرتا ہے، نہ قرابت داروں سے صلۂ رحمی کرتا ہے، نہ امانت ادا کرتا ہے اور نہ کسی فحش بات سے اجتناب کرتا ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کیوں کر آدمی میں یہ تمام باتیں پورے طور پر جمع کر دی گئیں جن میں اس کی بھلائی اور اس کے کام کا پورا ہونا ہے۔

گویائی کی طاقت اور اس کی حکمتیں

مفضل! غور کرو اس نعمت نطق (گویائی) پر جو اللہ تعالیٰ تقدست اسماءٔ نے اسے دی ہے جس سے یہ اپنے باطنی خیال اور دلی بات کو ظاہر کرتا ہے اور جسے اس کی فکر پیدا کرتی ہے اور اسی سے دوسروں کی دلی بات کو بھی سمجھتا ہے۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو یہ مثل چوپاؤں کے ہوتا جو نہ اپنے دل کی بات بیان کر سکتے ہیں اور نہ بیان کرنے والے کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس، تحریر کی صفت ہے جس سے گزشتہ لوگوں کے حالات موجودہ لوگوں کے لیے اور موجودہ لوگوں کے حالات آئندہ والوں کے لیے قید قلم میں لائے جاتے ہیں اور اسی کے ذریعے سے علوم و آداب وغیرہ کی کتابیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور اسی کے ذریعے سے

ان گفتگوؤں اور حساب وغیرہ کو یاد رکھنا ہے جو اس کے اور کسی غیر کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو ایک زمانے کی چیزیں دوسرے زمانے سے بالکل منقطع ہو جاتیں اور نیز ان لوگوں کی خبریں بھی نہ ملتیں جو اپنے اپنے وطنوں سے جدا ہیں اور علوم بھی معدوم ہو جاتے۔ آداب واخلاق کی باتیں بھی تلف ہو جاتیں اور بہت ہی بڑا خلل لوگوں کے کاموں اور معاملات میں اور نیز ان دینی چیزوں اور روایات میں واقع ہوتا جنہیں دیکھنے کی انہیں ضرورت ہے اور جن کا نہ جاننا ان کو ممکن ہی نہیں (بلکہ لازم ہے کہ انہیں دیکھیں۔)

شاید تم یہ خیال کرو کہ انسان نے اس ضرورت کو اپنی تدبیر اور فہم و زکاوت سے حاصل کیا ہے؟ انسان کی طبیعت وفطرت میں یہ قوت پیدا نہیں کی گئی ہے اور علیٰ ہذا القیاس گفتگو اور کلام ہے کیونکہ یہ بھی اصطلاحی اور قرار داد چیز ہے جسے لوگ آپس میں ٹھہرا لیتے ہیں اور اسی کے مطابق آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف فرقوں میں مختلف زبانیں ہیں، اور اسی طرح تحریریں، جیسے عربی تحریر اور سریانی اور عبرانی اور رومی وغیرہ جو ان تمام فرقوں میں مختلف ہیں ان کی ایک اصطلاح قرار دے لی ہے۔ جیسے کلام اور الفاظ کی اصطلاح۔

پس جو شخص اس کا دعویٰ کرے (کہ اس میں خدا نے کیا کیا ہے یہ تو آدمی نے خود بنا لی ہے) تو اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اگرچہ ان دونوں امور میں انسان کی تدبیر اور فعل کو دخل ہے لیکن جس چیز کے سبب سے وہ اس تدبیر اور اس فعل تک پہنچا وہ بیشک ایک عطیہ ہے اور خدائے تعالیٰ عزوجل کی بخشش ہے جو اس کی ساخت کے اندر قرار دی ہے (مثلاً عقل یا زبان، جس کے ذریعے سے ان اصطلاحات کے قائم کرنے کی اسے قدرت حاصل ہوئی ہے) پس اگر اس کو زبان نہ دی گئی ہوتی جس سے وہ گفتگو کرے اور ذہن نہ ملا ہوتا جس سے وہ کاموں کی راہ پا سکے تو وہ ہرگز بول نہ سکتا اور اگر اس کو ہتھیلی اور انگلیاں نہ دی گئی ہوتیں تو لکھنا کبھی اس سے ممکن نہ ہوتا۔

اس بات کی عبرت بہائم سے حاصل کرو جن کو نہ کلام کی طاقت ہے نہ تحریر کی۔ (کیونکہ ان میں نہ وہ ذہن ہے اور نہ وہ آلات تحریر و کتابت ہیں) پس (معلوم ہوا) دراصل یہ باری تعالیٰ و تقدس کا (قانون) فطرت ہے جس پر اسے پیدا کیا ہے، اور خلق پر اس کا ایک تفضّل ہے جو کوئی اس کا شکریہ ادا کرے گا اسے ثواب ملے گا اور جو اس نعمت کا کفران کرے گا تو کچھ پروا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہان سے مستغنی ہے۔ (اسے کسی کے شکر کی ضرورت نہیں۔)

انسان کا علم

مفضل! غور کرو ان چیزوں میں جن کا علم آدمی کو دیا گیا ہے اور جن کا علم نہیں دیا گیا، ان تمام چیزوں کا اسے علم دیا گیا، جن میں اس کے دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ خالق تبارک و تعالیٰ کی معرفت ہے جو دلیلوں اور ان شہادتوں کے ذریعے سے حاصل کی جائے جو اس کی مخلوقات کے اندر موجود ہیں اور ان امور کی معرفت ہے جو اس پر واجب ہیں۔ مثلاً تمام آدمیوں کے ساتھ انصاف کرنا۔ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، امانت کا ادا کرنا، محتاجوں کی غم خواری کرنا، وغیرہ وغیرہ جن کی معرفت اور جن کا اقرار فطرتاً اور قدرتاً تمام اُمتوں میں ہے خواہ وہ ہمارے موافق ہوں یا مخالف۔ علیٰ ہذا القیاس اسے ان چیزوں کا علم دیا گیا ہے۔ جن میں اس کی دنیا کی بھلائی ہے۔ جیسے زراعت، باغبانی، زمینوں کا آباد کرنا، بھیڑوں اور چوپاؤں کا جمع کرنا، پانی کا کنوؤں یا چشموں وغیرہ سے نکالنا، جڑی بوٹیوں کی شناخت جن سے بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے، معدن کی پہچان، جن سے قسم قسم کے جواہر نکالے جاتے ہیں، کشتی پر سوار ہونے، دریا میں غوطہ خوری اور وحوش و طیور اور مچھلیوں کے شکار کرنے کی انواع و اقسام کی تدبیریں، صنعت و حرفت کرنے اور تجارت و کسب معاش کے طریقوں کی معرفت اور ان کے علاوہ بہت سے اور چیزیں ہیں جن کے بیان میں طول ہے اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے جن

میں انسان کی دنیاوی زندگی کے کاموں کی درستی ہے۔ تو ان چیزوں کا علم دیا گیا ہے جس میں اس کی دینی اور دنیاوی بہتری ہو۔ علاوہ اس کے اور جو باتیں ہیں جن کا جاننا اس کی طاقت سے باہر ہے اور نہ اس کی حالت اس کی مقتضی ہے۔ ان کا علم اسے نہیں دیا گیا۔ مثلاً علم غیب اور جو بات آئندہ ہونے والی ہے۔ یا بعض وہ چیزیں جو پہلے ہو چکی ہیں۔ جیسے آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی چیزوں کا جاننا اور جو دریاؤں کے اندر ہے اور عالم کے چاروں طرف ہے یا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہے۔ یا جو رحم کے اندر ہے وغیرذلک ان کا علم آدمیوں کو نہیں دیا گیا ہے اور جن لوگوں نے ان کے جاننے کا دعویٰ کیا، ان کے دعوؤں کو ان باتوں نے باطل کر دیا جو برخلاف ان کے بیان کے ظاہر ہوئیں (اور جس کے جاننے کا انہوں نے دعویٰ کیا تھا اس کے مخالف ہوئیں۔)

لہٰذا دیکھو، اے مفضل! کہ انسان کو کس طرح تمام ان چیزوں کا علم عطا ہوا جو اس کے لیے اس کے دنیاوی اور دینی امور میں ضروری ہیں۔ اور اس کے ناروا چیزوں کے جاننے سے روک دیا گیا تا کہ اس کی قدر اور اس کا نقصان معلوم ہو جائے (یعنی تا کہ معلوم ہو جائے کہ آدمی دراصل ایک بے حقیقت چیز ہے اس میں بہت کچھ نقصان اور کمی ہے جس سے اس کو غرور و نخوت نہ پیدا ہونے پائے) اور ان دونوں باتوں میں اس کی بہتری ہے (اگر ان امور غیبیہ وغیرہ کا بھی اس کو علم دیا جاتا تو انسان کا غرور حد سے زیادہ ہو جاتا، جبکہ تھوڑے سے علم پر آدمی پھولا نہیں سماتا تو جس کی تمام معلومات غائب و حاضر اس کے پیش نظر ہو جاتے تو اپنے تئیں خدا ہی کہنے لگتا۔) لہٰذا ان چیزوں کی معرفت سے محروم رکھا گیا تا کہ جانے کہ میں ایک انسان ناقص ہوں مجھ سے بھی کوئی بڑھ کر موجود ہے۔ جسے ان کا بھی علم ہے اور وہ باری تعالیٰ عزاسمہٗ ہے۔)

اب اے مفضل! ذرا غور کرو کہ انسان کو اس کی مدت حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا،

وہ اس وجہ سے کہ اگر آدمی اپنی زندگی کو جان لیتا اور بالفرض اس کی زندگی بھی تھوڑی ہوتی تو زندگی نہایت تلخ ہو جاتی، کیونکہ اب وہ اس جان لینے اور علم کی وجہ سے موت کا منتظر اور اس وقت کا متوقع رہتا، بلکہ وہ اس شخص کے مانند ہو جاتا کہ جس کا تمام مال برباد ہو گیا ہو یا قریب بربادی کے ہو اور وہ اپنی مفلسی اور فقیری کو محسوس کر رہا ہو تو اس کو اپنے مال کے فنا ہونے اور اپنے فقر کا کیسا ڈر ہو گا، بلکہ وہ غم واندوہ جو اسے اپنی زندگی کے فنا ہونے کی طرف سے پیدا ہو گا وہ اس خوف سے کہیں زیادہ ہو گا جو اسے اپنے مال کے خیال میں ہو گا۔ کیونکہ جس شخص کا مال تلف ہو جائے اسے تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس کے عوض اور مل جائے گا اور اس سے اس کے دل کو تسکین ہو جائے گی۔ بخلاف اس کے جسے اپنی زندگی کے فنا ہونے کا یقین ہو جائے تو اس کی ناامیدی قوی ہو جائے گی اور اگر اس کی عمر زیادہ ہوتی اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں زیادہ مدت تک زندہ رہوں گا تو اسے اپنی بقا پر بھروسہ ہو جاتا اور دنیاوی لذتوں اور جملہ معصیتوں میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا اور اس خیال سے گناہ کرتا، کہ آج تو اپنی شہوت پوری کر لوں، پھر آخر میں توبہ کر لوں گا۔ حالانکہ یہ وہ بات ہے جسے پروردگار عالم اپنے بندوں سے نہیں چاہتا، اور نہ اسے پسند کرتا ہے۔ (بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ بندہ ہمہ وقت میری ہی طرف متوجہ رہے ملاہی و بدعت میں بالکل نہ مصروف ہو۔)

دیکھو! اگر تمہارا کوئی غلام کسی کام کو اس خیال سے کرے کہ سال بھر تو تم کو ناراض رکھے اور ایک دن یا ایک مہینہ تم کو راضی رکھے تو ہرگز تم اس کی یہ بات پسند نہ کرو گے۔ اور تمہارا یہ غلام نیک اور صالح غلام کے رُتبے پر (تمہارے نزدیک) نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے اگر وہ ہر وقت اور ہر حالت میں تمہاری اطاعت اور خلوص ہی دل میں رکھے (تو وہ ضرور تمہیں بہت زیادہ محبوب ہو گا۔)

اس پر اگر تم یہ اعتراض کرو کہ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مدت تک آدمی نافرمانی کرتا

رہے۔ پھر جب توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ یہ اسی صورت میں ہوتا ہے کہ جب انسان کی خواہش نفسانی غالب نہ آ جائے اور اس کی مخالفت کر سکے اور دل میں یہ نہ ٹھان لے (کہ ہم مخالفت ہی کیے جائیں گے) اور اسی پر موقوف نہ رکھے (کہ آج چین کر لیں، کل توبہ کر لیں گے) تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرتا ہے اور اپنے تفضّل سے اس کو معاف کرتا ہے۔ لیکن جو کوئی یہ ٹھان لے کہ جب تک اس کے دل میں ہے ایسے شخص کو جو اس کے دھوکے میں نہیں آ سکتا، کہ اس وقت تو نقداً نقد لذت اٹھالے اور اپنے تئیں آئندہ توبہ کا امیدوار اور موعود بنائے اور نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے وعدے کو پورا نہ کر سکے گا کیونکہ ناز پروری اور تلذذ سے باز آنا اور توبہ کی زحمت اٹھانا خصوصاً بڑھاپے اور بدن کی کمزوری کے زمانے میں نہایت دشوار امر ہے اور جو شخص توبہ میں حیلہ حوالہ کرتا ہے اس پر اس امر کا بھی امن نہیں ہے کہ دفعتاً موت اسے ہلاک کر دے اور وہ بغیر توبہ کیے دنیا سے چلا جائے۔ مثلاً کسی شخص پر قرض ہو اور وہ اس کے ادا کر دینے پر قادر بھی ہو باوجود اس کے ادائے قرض میں حیلہ حوالہ کرتا رہے یہاں تک کہ موت آ جائے اور مال بھی فنا ہو جائے تو وہ قرض اس کے اوپر قائم رہ جائے گا۔

لہٰذا، انسان کے لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس کی مقدار عمر کا علم اس سے مخفی رکھا جائے تا کہ وہ اپنی تمام عمر موت کا منتظر رہے اور اس ڈر سے گناہوں کو ترک کرے اور نیک عمل اختیار کرے۔

اب اگر تم یہ اعتراض کرو کہ اس وقت بھی جبکہ اس کی مدت عمر کا حال اسے نہیں معلوم اور وہ ہر وقت موت کا ترقب رکھتا ہے، بدکاریوں کا مرتکب ہوتا ہے اور حرام کام کر لیتا ہے، تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ:

''اس معاملے میں تدبیر تو ایسی ہی کی گئی ہے جس پر یہ کام جاری ہے۔ اب اگر

باوجود اس کے کوئی شخص نہ باز آئے اور برائیوں سے نہ پرہیز کرے تو یہ اس کی بداعتدالی مزاج اور قساوت قلبی ہے۔ اس میں اصل تدبیر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ جیسا کہ طبیب ان چیزوں کو مریض سے بیان کر دیتا ہے جن سے اس نفع پہنچے، پھر بھی اگر مریض اس کی بات نہ مانے، اس کے مشورے پر نہ چلے، اس کے منع کیے ہوئے امور سے باز نہ رہے، تو بھی طبیب کی بتائی ہوئی باتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا اور اس میں طبیب کی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ اسی بیمار کی برائی ہے کیونکہ اس نے طبیب کا کہنا نہیں مانا۔

اور اگرچہ انسان باجود امید موت کے جو اسے عدم علم زمانہ موت کی حالت میں ہر وقت حاصل ہے گناہوں سے باز نہیں رہتا، لیکن اگر اسے اپنی بقا وطول حیات پر پورا بھروسہ ہو جائے تو پھر وہ نہایت ہی بد اور ناگوار گناہان کبیرہ کرنے لگے گا اور موت کا انتظار اور خیال اس کے لیے ہر حال میں بہ نسبت اپنی طول حیات و بقا پر بھروسہ کرنے کے بہتر ہے۔ (کہ اس سے کچھ تو اس کے دل میں ڈر رہے گا، کچھ تو خدا کا خیال کرے گا جس سے وہ گناہان سخت سے بچ سکے گا) اور اگر ایسا ہے کہ ایک قسم کے آدمی باوجود ترقب موت کے اس سے غافل ہیں اور اس سے نصیحت نہیں حاصل کرتے تو دوسرا گروہ ایسا بھی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور معصیت سے باز رہتا ہے اور عمل صالح بجالاتا ہے اور محتاجوں اور فقیروں کو صدقہ دینے کے لیے اپنے مال اور نفیس اشیاء میں بخشش سے کام لیتا ہے، تو ہرگز انصاف نہیں تھا کہ یہ لوگ اس بات سے فائدہ اٹھانے سے محروم کیے جاتے (اور وہ لوگ اس میں سے حصہ نہ لیتے۔) (یعنی ایک کے نہ فائدہ اٹھانے سے دوسرا اس فائدے سے کیوں محروم کیا جاتا، لہٰذا حال موت مخفی کیا گیا کہ جس شخص سے بھی ہو سکے اس سے فائدہ اٹھالے اور جو نہ فائدہ اٹھائے وہ اس کی بدنصیبی۔)

مفضل! غور کرو، خوابوں میں (رات کے وقت آدمی جو خواب دیکھتا ہے) اس میں

کیا حکمت و مصلحت صرف کی گئی ہے اور سچے خواب کو جھوٹے میں مخلوط کر دیا ہے پس اگر سب کے سب خواب سچے ہوتے تو تمام آدمی انبیاء ہی ہو جاتے۔ (پھر وہ حکمت جو اصل خلقت انسان میں ہے فوت ہو جاتی یعنی معاملہ امتحان۔) اگر تمام خواب جھوٹے ہی ہوتے تو اس میں کچھ فائدہ نہ تھا بلکہ زائد بیکار اور بے معنی ہوتے۔

لہٰذا، کبھی تو خواب سچے ہوتے ہیں تا کہ آدمی اس سے اپنی اس مصلحت و کاروبار میں فائدہ اٹھائے جس کی اسے ہدایت ملی ہے یا جس نقصان کا اسے حال معلوم ہوا ہے۔ اس سے بچاؤ کرے اور اکثر خواب جھوٹے ہوتے ہیں تا کہ آدمی انہیں پر پورا بھروسہ نہ کرلے۔ (کہ جو ہم خواب دیکھیں گے اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر خدائے تعالٰی کی طرف رجوع کرنے اور بھلائی برائی میں اس سے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ معلوم ہوتی۔)

غور کرو اے مفضل! ان چیزوں میں جنھیں تم عالم میں موجود دیکھ رہے ہو اور جو اس لیے مہیا کی گئی ہیں کہ آدمیوں کو ان کی ضرورت ہے۔

مٹی تو مکان بنانے کے لیے اور لوہا، دستکاری کے لیے، لکڑی، کشتی وغیرہ بنانے کے واسطے، پتھر، چکیاں وغیرہ بنانے کے واسطے، تانبا، برتنوں کے واسطے، سونا، چاندی، معاملات (لین دین) کے لیے جواہرات، ذخیرہ کرنے کے واسطے، اناج، غذا کے واسطے، پھل، تفکہ کے واسطے، گوشت، کھانے کے لیے، خوشبوار چیزیں، لذت حاصل کرنے کے واسطے، دوائیں، بیماروں کو صحیح و تندرست کرنے کے لیے۔ چوپائے، بار برداری کی غرض سے، سوکھی لکڑیاں، آگ جلانے کے واسطے، راکھ، چونا بنانے کے لیے ریت، زمین کے فائدے کے لیے اور کوئی کس قدر ایسی چیزوں کو شمار کرے۔ یعنی ایسی ہی بیشمار چیزیں ہیں جن کا حصر نہیں ہوسکتا۔)

تو کیا اے مفضل! تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مکان میں داخل ہو اور دیکھے کہ اس میں انسان کی تمام ضرورت کی چیزیں مہیا و موجود ہیں تمام مکان ہی اس خزانے

سے بھرا پڑا ہے، اور دیکھے کہ ہر ایک چیز ایک خاص سبب سے رکھی ہوئی ہے تو کیا وہ یہ خیال کرے گا کہ اس کا رکھنے والا کوئی نہیں خود بخود رکھی گئی ہیں کیونکر کوئی عقلمند آدمی اس بات کو تجویز کرسکتا ہے کہ یہ عالم اور جو کچھ اس کے اندر ہے خود بخود ہو گیا ہے (اور کوئی ان کا خالق نہیں ہے)۔

اے مفضل! ان چیزوں سے عبرت حاصل کرو جو انسان کی ضرورتوں کے لیے بنائی گئی ہیں اور ان میں کیا حکمت ہے؟

تو دیکھو! اس کی خوراک کے واسطے غلّہ پیدا کیا گیا اور اسے اس کے پیسنے، گوندھنے اور روٹی پکانے کی تکلیف دی گئی۔ اون اس کے لیے پیدا کی گئی اور اسے اس کے دھننے، اس کو کاتنے اور اسے بُننے کی تکلیف دی گئی۔ درخت اس کے لیے پیدا کیا گیا، اور اس کا بونا، اس کا سینچنا، اس کی نگہداشت اس کے متعلق کی گئی، جڑی بوٹیاں اس کی دوا کے لیے بنائی گئیں اور ان کے حاصل کرنے ان کو باہم ملانے، ان کو بنانے کی تکلیف اسے دی گئی اور علیٰ ہذا القیاس تم تمام چیزوں کو اسی طرح پاؤ گے۔ تو دیکھو کہ ان کے بنانے والے نے کیونکر ان چیزوں کو بنا کر انسان کی مدد کی جن میں بالکل اس کی تدبیر کارگر نہ ہو سکتی تھی اور ان میں عمل و تصرف کرنے کی ضرورت اور محل کو اسی پر چھوڑا کیونکہ اس کی بہتری اسی میں تھی، اس لیے کہ اگر وہ (خدائے تعالیٰ) ان کاموں کو بھی کر دیتا (جو انسان کے متعلق ہیں۔ مثلاً اناج کا پیسنا، اس کا صاف کرنا، اسے گوندھنا اور پھر روٹی پکانا) اور اس کے لیے ان چیزوں میں تصرف و عمل کی ضرورت ہی نہ رہتی تو وہ فخر اور نخوت سے زمین پر پنجوں کے بل چلنے لگتا اور زمین اسے اٹھا نہ سکتی (حد کی نخوت اس کے مزاج میں پیدا ہو جاتی) اور یہ بات اسے اس حد تک پہنچا دیتی کہ وہ ایسے کام کرنے لگتا جس میں اس کی تباہی اور ہلاکت ہوتی۔

---

[1] ظاہر ہے کہ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں جو انسان خود پیدا نہیں کرسکتا تھا، پھر ضرورت کے وقت کہاں سے لاتا۔ لہٰذا مدبر عالم نے ان چیزوں کو پہلے سے ہی پیدا کر دیا۔

نیز اگر انسان کی تمام ضروریات ہاتھ کے عمل کے بغیر موجود کر دیتا تو ان کی زندگی کچھ خوش گوار نہ ہوتی، اور نہ اس چیز کی کچھ لذت ان کو ملتی (کیونکہ وہ بغیر مشقت حاصل ہوئی ہے اور جو چیز بغیر مشقت ملتی ہے اس کے ملنے کی نہ انسان کو کچھ قدر ہوتی ہے اور نہ اس سے اس کی روح کو کچھ فرحت حاصل ہوتی، ہاں اگر مشقت اور محنت کے بعد حاصل ہو تو اس کے ملنے سے دل کو کیفیت آتی ہے اور وہ اس سے خوش ہوتا ہے جبکہ اپنی کوشش کا نتیجہ سامنے دیکھ لیتا ہے۔)

کیا تم، اے مفضل! نہیں دیکھتے کہ جو شخص کہیں مہمان کے طور پر جاتا ہے اور وہاں ایک عرصہ تک قیام کرتا ہے اور اس کی تمام ضروریات میزبان کی طرف سے برابر ملتی رہتی ہیں نہ اسے کھانے کی چیزیں مہیا کرنی پڑتی ہیں نہ پینے کی نہ سونے بیٹھنے کی۔ بالآخر وہ اس بیکار رہنے اور معطل بیٹھنے سے اکتا جاتا ہے اور اپنے لیے کوئی مشغلہ تلاش کرنے لگتا ہے۔ تو کیا حال ہوتا جبکہ تمام عمر اسے کوئی کام ہی نہ کرنا پڑتا۔ (روٹی پکی پکائی مل جاتی، کپڑے سلے سلائے آ جاتے، درخت بغیر باغبانی کیے ہوئے پھل اپنے دے دیتے اور اس کے منہ تک پہنچا دیتے) تو انسان کے لیے یہی مصلحت ٹھہری کہ اس کے لیے ان کاموں میں ہاتھ لگانے کی ضرورت باقی رکھی گئی تاکہ معطل اور بیکار بیٹھنا اس کو خاطر برداشتہ نہ کر دے اور ان کاموں کے کرنے سے روکے جنہیں وہ حاصل نہیں کر سکتا اور اگر حاصل بھی کر لے تو اس میں اس کے لیے کوئی بھلا نہ ہو۔ مثلاً بعض آدمی جن کے پاس دولت ہوتی ہے اور وہ بیکار رہتے ہیں تو ان کو یہ دھن سماتی ہے کہ کیمیا بنانا چاہیے۔ اس فکر میں ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں، گھر کا اثاثہ ضائع کرتے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کیوں ہوا؟ اسی وجہ سے تو، کہ وہ بیکار بیٹھے تھے طبیعت تو چاہتی ہے کہ کوئی شغل اس کے لیے ہونا چاہیے۔ لہٰذا ادھر متوجہ ہوئے اور جب ادھر متوجہ ہوئے تو مال و زر ضائع ہوا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا، اور اگر کسی کو لاکھ دو لاکھ میں کچھ معلوم بھی ہو گیا تو اس

کے لیے فائدے مند نہیں ہوتا۔ تجربہ اس پر شاہد ہے۔

پس حکیم علی الاطلاق اور مدبر عالم نے اپنی قدرت سے اس کے لیے پہلے ہی مشغلے پیدا کر دیے ہیں۔ جن میں مصروف رہے اور فضول کاموں میں ہاتھ نہ ڈالے جن سے اس کو نقصان پہنچے)۔

جان لو اے مفضل! کہ انسان کی اصل معاش و زندگی روٹی اور پانی ہے۔ تو دیکھو! کہ ان میں کیا کیا تدبیریں صرف کی گئی ہیں۔

آدمی کو پانی کی ضرورت روٹی کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور یہ اس سبب سے ہے کہ انسان بھوک پر بہ نسبت پیاس کے زیادہ صبر کر سکتا ہے اور جس قدر روٹی کا محتاج ہے اس سے زیادہ پانی کا محتاج ہے کیونکہ اسے پانی کی ضرورت پینے کے لیے پڑتی ہے، وضو میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، کپڑا دھونے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، چوپاؤں کو پلانے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، زراعت کے سینچنے میں یہ درکار ہے۔ لہٰذا پانی تو ایسا عام بنایا گیا ہے جس کے خریدنے کی ضرورت نہ ہو، تاکہ انسان کو اس کی تلاش میں مشقت نہ اٹھانی پڑے، اور روٹی ایسی بنائی گئی کہ اس کی تحصیل دشوار ہو اور بغیر تدبیر کے ہاتھ نہ آ سکے، تاکہ انسان کا یہ شغل برقرار رہے اور اسے تبختر و نخوت کا موقع نہ دے اور فضول کاموں سے روکے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک بچہ جبکہ وہ بالکل صغیر السن ہوتا ہے معلم کے پاس تعلیم کے لیے بھیج دیا جاتا ہے، صرف اس لیے کہ کھیل کود میں مصروف نہ ہونے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو یا اس کے عزیزوں کو اس سے کوئی تکلیف اٹھانی پڑے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر انسان بالکل شغل سے خالی ہوتا تو ناز و تبختر اور فضول کاری اور نخوت سے ایسے کام کر گزرتا جن کا نقصان اسے بہت سخت پہنچتا۔

اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً جو شخص بالکل آرام و آسائش اور اپنے اقربا کی تونگری اور خوش عیشی اور ناز و نعم وغیرہ میں پلا ہو، وہ ان امور میں پڑ جاتا ہے۔

ایک آدمی دوسرے آدمی سے کیوں مشابہ نہیں ہوتا؟

سمجھو! کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کیوں مشابہ نہیں ہوتا، جیسا کہ وحوش و طیور وغیرہ صورت میں ایک سے ہوتے ہیں۔ تم ہرنوں اور چکوروں کا ایک گلہ اور جھنڈ دیکھتے ہو جس میں کا ہر ایک جانور یا پرندہ دوسرے سے مشابہ ہوتا ہے اور کوئی فرق ان میں باہم محسوس نہ ہوتا ہے، لیکن آدمیوں کو دیکھتے ہو کہ سب کی صورتیں اور ساخت جدا جدا ہیں۔ یہاں تک کہ دو آدمی ایک شکل و صفت کے کم ہی دکھائی دیں گے۔

سبب اس میں یہ ہے کہ ان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر ایک آدمی اپنی صورتوں اور حلیوں سے پہچانا جائے کیونکہ ان میں باہم معاملات ہوتے رہتے ہیں اور یہ معاملات بہائم وغیرہ میں نہیں ہوتے، تاکہ ایک کو دوسرے کے شخصی طور پر پہچاننے کی ضرورت ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وحوش و طیور کا باہم متشابہ ہونا انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، مگر انسان ایسا نہیں ہے کیونکہ اتفاقاً اگر کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ توام پیدا ہونے والے دو بچے ایک دوسرے سے مشابہ ہوں تو لوگوں کو ان سے معاملات میں سخت مشکل اور دشواری پیش آتی ہے اور جو ایک کو دینا چاہیے وہ دھوکے سے دوسرے کو دیا جاتا ہے، اور ایک کے بدلے مواخذہ میں دوسرے کو پکڑا جاتا ہے اور ایسا ہی کبھی اور چیزوں میں بھی بہ سبب مشابہت کے پیدا ہو جاتا ہے۔ (مثلاً عطار کو دوا میں بیخ بادیان دینی ہے اور دھوکے میں وہ بیخ کنیر دے دیتا ہے یا بخار کی گولی دینی ہے اور وہ بہ سبب مشابہت کے جمال گوٹے کی گولیاں دے دیتا ہے جس سے مریض کو سخت نقصان پہنچتا ہے) چہ جائیکہ صورت کا تشابہہ (یہ تو اور بھی نقصان رساں ثابت ہوتا) تو کس نے اپنے بندوں کے لیے ایسی باریکیاں اور لطائف پیدا کیے جن کا خطور بھی دل میں ہونا دشوار ہے کہ اس کی خوبی پر مطلع ہو۔ ہاں یہ اسی نے پیدا کیے جس کی رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔ (فتبارک اللہ احسن الخالقین) کیا طبیعت اور نیچر میں بھی یہ طاقت ہے کہ ایسے ایسے لطائف کو سمجھے

اور پھر اسے مناسب موقعوں اور ضرورتوں کے ساتھ حسب حال پیدا کر سکے۔ توبہ کرو۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اے مفضل! اگر تم کسی آدمی کی تصویر دیوار پر کھینچی ہوئی دیکھو اور تم سے کوئی کہے کہ یہ تصویر خود بخود ظاہر ہوئی ہے کسی بنانے والے نے اسے نہیں بنایا ہے تو کیا تم اس بات کو مان لو گے؟ نہیں، بلکہ تم اس کی بات پر ہنسو گے۔ تو کیوں کر تم ایک بے حس تصویر کی بابت اسے نہیں مانتے کہ وہ بغیر بنائے ہوئے بن گئی اور ایک انسان جیتے جاگتے، بولتے چالتے ہوئے کی نسبت ماننے کے لیے تیار ہو کہ وہ خود بخود پیدا ہو گیا۔

جانداروں کے جسم مخصوص حد تک کیوں بڑھتے ہیں؟

ایسا کیوں ہوا کہ جانداروں کے جسم باوجودیکہ ہمیشہ غذا کھاتے رہتے ہیں برابر بڑھتے ہی نہیں رہتے بلکہ نمو کی ایک حد تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھتے، اگر اس میں کوئی حکمت نہیں تو ایسا کیوں ہے؟

اس میں حکیم مطلق کی تدبیر یہ ہے کہ حیوانات کی ہر صنف کے جسموں کی مقدار ایک حد معین پر رہے۔ نہ اس سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ اور وہ بڑھتے رہتے ہیں جب اس حد معین پر پہنچتے ہیں، ٹھہر جاتے ہیں، حالانکہ غذا برابر جاری رہتی ہے منقطع نہیں ہوتی۔ اگر برابر بڑھتے ہی رہتے تو وہ اجسام نہایت بڑھ جاتے اور ان کی مقداریں مشتبہ ہو جاتیں، اور کسی کی کوئی حد معروف و معلوم نہ رہتی۔

انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے؟

خاص کر آدمیوں کے بدن میں ایسا کیوں ہے کہ حرکت اور مشی سے ان میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور باریک صنعتوں سے بھاگتے ہیں؟

اسی وجہ سے نا، کہ جن چیزوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً لباس، خواب گاہ

وغیرہ ان میں اسے زیادہ مشقت ہو (اور پھر اسے اپنے کام کی قدر ہو کیونکہ اگر بغیر تکلیف کے کوئی بات حاصل ہو تو اس کی قدر نہیں ہوتی اور نیز یہ بھی سبب ہے کہ) اگر آدمی کو کوئی تکلیف اور درد نہ ہوا کرتا، تو وہ بدکاریوں سے کیوں بچتا، اور اللہ کے سامنے کیوں جھکتا، اور لوگوں پر کیوں مہربانی کرتا؟

کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب کسی کو درد کی تکلیف ہوتی ہے، فوراً اس نے خدا کے سامنے خضوع وخشوع سے سر جھکا دینا ضروری سمجھا، اور عاجزی کرنے لگتا ہے اور اپنے پروردگار کی طرف صحت حاصل کرنے کے لیے مائل ہوتا ہے اور صدقہ دینے میں اپنے ہاتھ کھول دیتا ہے۔

اور اگر آدمی کو مار کھانے سے تکلیف نہ محسوس ہوتی تو بادشاہ سرکشوں اور بدکاروں کو کس طرح سے سزا دیتا، اور بچے علوم وصناعات کیوں کر سیکھتے (چوٹ لگنے کا ڈر تو ختم ہی ہو جاتا) اور غلام اپنے آقاؤں کے سامنے کیوں کر انکساری کرتے اور دل سے ان کی اطاعت کیوں کر کرتے؟

کیا اس میں ابن ابی العوجاء (دہریہ مذکور الصدر) اور اس کے ساتھ والوں کی جو تدبیر کے منکر ہیں اور مانویہ کی جو تکلیف اور درد کی حکمت کو مانتے ہی نہیں (یعنی کہتے ہیں کہ تکلیف جو انسان کو پہنچتی ہے اس میں کوئی حکمت اور فائدہ نہیں، بلکہ لغو بات ہے) کچھ تنبیہ و توبیخ نہیں ہے (یہ تو سب کچھ ہے مگر بے عقلی اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج ہے؟)

حیوانات میں صرف نر یا صرف مادہ ہی کیوں نہ پیدا ہوئے؟

اگر حیوانات میں صرف نر ہی پیدا ہوتے مادہ نہ ہوتی یا صرف مادہ ہی پیدا ہوتی اور نر نہ ہوتے تو کیا نسل نہ منقطع ہو جاتی اور اس کے ساتھ حیوانات کے تمام اجناس و اصناف فنا نہ ہو جاتے۔ لہٰذا بعض بچے تو نر پیدا ہوتے ہیں اور بعضے مادہ تا کہ ہمیشہ نسل برقرار

رہے اور یکبارگی ختم نہ ہو جائے۔

سنِ بلوغ پر مرد کے ڈاڑھی کیوں نکلتی ہے؟

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مرد، عورت جب سن شعور و بلوغ کو پہنچتے ہیں تو صرف مرد ہی کے ڈاڑھی کیوں نکلتی ہے، عورت کے کیوں نہیں نکلتی؟ اگر اس میں حکمت و تدبیر نہیں تو کیا ہے؟

یہ اس سبب سے ہے کہ چونکہ پروردگار نے مرد کو حاکم اور عورت کا منتظم و نگہبان بنایا ہے۔ اور عورت کو اس کی دلہن اور کارکن۔ لہٰذا مرد کو ڈاڑھی عطا کی کیونکہ اس میں عزت، جلالت اور ہیبت ہے اور عورت کو نہ دی، تاکہ اس کے چہرہ کا حسن اور تازگی باقی رہے، جو خوش فعلی اور ہمخوابی کے لیے نہایت مناسب ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے! کہ حکیم عزوجل کی تدبیر سے یہ خلقت کیسی کیسی خوبیاں ظاہر کرتی ہے جس میں بالکل غلطی کو دخل نہیں۔ جس قدر جس چیز کی ضرورت ہے اسی قدر مہیا ہوتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں ہوتی، نہیں مہیا کی جاتی۔ (مثلاً مرد کے لیے ڈاڑھی کی ضرورت تھی وہ اسے ملی۔ عورت کو اس کی ضرورت نہ تھی اس کو نہ ملی۔)

مفضل کہتے ہیں کہ دوران گفتگو زوال کا وقت آ گیا۔ آقا، نماز کے لیے اٹھے اور فرمایا کہ ''کل صبح کو انشاء اللہ میرے پاس آنا''۔ میں وہاں سے ان معلومات کے حاصل ہونے سے نہایت خوش خوش اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اس نعمت پر جو اس نے مجھے دی تھی، واپس آیا۔ تمام شب نہایت خوشی میں بسر کی کہ میرے آقا نے کیا کچھ مجھے عطا فرمایا، اور کیا کیا نہ تعلیم فرمائی۔

دوسری نشست

مفضل کہتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اذنِ حضوری لیا گیا اور میں داخل بیت الشرف ہوا۔ آپؑ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں جو گردش زمانہ کا مدبر (یا اس کا گردش دینے والا، دور زمانہ کا، یکے بعد دیگر لانے والا) اور قرنہائے دہر کو ایک درجے کے بعد دوسرا درجہ اور ایک عالم بنا کر لانے والا ہے، تاکہ بدکاروں کو ان کی برائیوں کا بدلہ دے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا، اس لیے کہ وہ عادل ہے تمام نام اس کے مقدس ہیں۔ اور نعمتیں اس کی بڑی ہیں۔ وہ آدمیوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن انسان خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس پر خدا کا کلام گواہ ہے کہ ''جو شخص ایک ذرہ کے بقدر نیکی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کا عوض پائے گا''۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی اس کی کتاب (قرآن مجید) میں ہیں جس کے اندر تمام چیزوں کی تفصیل و توضیح موجود ہے۔ نہ جھوٹ اس کے سامنے آ سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے۔ وہ حکیم مطلق اور محمود کل کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے۔'' اور اسی وجہ سے سید عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انما ھی اعمالکم ترد الیکم ۔ یہ تمہارے اعمال تمہیں کو واپس کر دیے جائیں گے۔ (یا یہ کہ یہ سزا و جزا تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جو تمہیں لوٹا

دیا گیا) یعنی خدائے تعالیٰ کو کچھ ان اعمال سے فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ ان کا فائدہ تمہیں کو قیامت میں پہنچے گا)"۔

پھر امام علیہ السلام نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور ارشاد فرمایا:

"اے مفضل! یہ خلق حیران و سرگردان ہے، اندھی ہے، متوالی ہے، اپنی سرکشی کے اندر چلتی ہے۔ اپنے شیطانوں اور شیطان نما لوگوں کی پیروی کرتی ہے۔ آنکھ والے تو ہیں مگر اندھے ہیں کچھ نہیں دیکھتے۔ زبان والے تو ہیں مگر گونگے ہیں کچھ نہیں سمجھتے۔ کان والے تو ہیں مگر بہرے ہیں کچھ نہیں سنتے۔ پستی و حقارت میں خوش ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پا گئے۔ عاقلوں کے درجہ سے پھرے ہوئے ہیں۔ گندے و نجس "لوگوں کے" سبزے کو چرتے ہیں (یعنی جو کہ مہمل لوگ کہتے ہیں، وہی یہ بھی کہنے لگتے ہیں۔ یہ نیچر فاعل ہے یا طبیعت وغیرہ وغیرہ۔) گویا وہ موت کے ناگہاں آ جانے سے امن میں ہیں اور بدلہ پانے سے بچائے ہوئے ہیں۔ افسوس کس قدر بدبخت ہیں اور ان کا رنج اور ان کی تکلیف کس قدر طولانی ہو گی۔ اور ان کی بلا کس قدر سخت ہو گی جس دن کہ کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا، اور نہ ان کی بالکل مدد کی جائے گی۔ (یعنی قیامت کے دن) البتہ وہ جن پر اللہ ہی رحم کرے۔

مفضل کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں رونے لگا۔ آپؑ نے فرمایا: "نہ روؤ، تم تو بچ گئے، کیونکہ تم نے حق کو قبول کیا، اور نجات پالی، اس لیے کہ تم نے معرفت حاصل کر لی۔"

پھر فرمایا: ''اب میں چاہتا ہوں کہ تم سے حیوانات کا حال بیان کروں تا کہ تم کو ویسا ہی حال ان کا بھی معلوم ہو جیسا کہ اس کے علاوہ اوروں کا حال معلوم ہوا۔

حیوانوں کی جسمانی کیفیت

غور کرو حیوان کے بدن کی بناوٹ اور اس ہیئت و انداز میں جس پر وہ بنائے گئے ہیں۔ نہ وہ پتھر جیسے سخت ہیں، کیونکہ اگر ایسے ہوتے تو مڑ نہ سکتے اور کاموں میں تصرفات نہ کر سکتے اور نہ وہ نرم ہی ہیں، ورنہ پھر اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوتا اور بلا سہارے مستقل بنفسہٖ قائم رہ سکتے۔ لہٰذا وہ ایسے نرم گوشت سے بنائے گئے ہیں جو بآسانی دُہرے ہو سکتے اور مڑ سکتے ہیں، اور ان کے اندر سخت ہڈیاں قرار دی گئیں جنہیں پٹھے پکڑے ہوئے ہیں اور رگیں مضبوط باندھے ہوئے ہیں اور ایک کو دوسرے سے ملائے ہوئے ہیں۔ ان ہڈیوں اور پٹھوں کے اوپر ایک جلد قائم کی گئی ہے جو تمام بدن کو محیط ہے۔

اسی کے مشابہ یہ تصویریں (مورتیں اور کٹھ پتلیاں) ہیں جو لکڑی سے بنائی جاتی ہیں اور انہیں کپڑوں میں لپیٹتے اور ڈوریوں سے باندھتے ہیں اور اس کے اوپر سے گوند کا وارنش کر دیتے ہیں، لکڑی کو تم ہڈیاں تصور کرو اور کپڑوں کو گوشت اور ڈوریوں کو پٹھے اور رگیں اور وارنش کو جلد سمجھو۔ تو اگر چلنے پھرنے والے حیوانات میں ایسا ہو سکتا، کہ خود بخود یہ چیزیں بن گئی ہیں (یعنی رگیں، پٹھے، گوشت، ہڈیاں اور ان کا باہم ارتباط و تعلق) تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ ان مردہ تصویروں میں بھی ایسا ہی ہو سکے (یعنی خود بخود ان پر وارنش پھر جائے، کپڑے لپٹ جائیں اور ڈوریاں بندھ جائیں) اور اگر ان مورتوں (کٹھ پتلیوں) میں ایسا ممکن نہیں ہے تو حیوانات میں بدرجہ اولیٰ ناممکن ہوگا۔

اس کے بعد ان حیوانات کے بدنوں کو غور سے دیکھو۔ چونکہ یہ آدمی کے جسموں کی

طرح گوشت، ہڈی اور پٹھوں سے پیدا کیے گئے ہیں، لہٰذا ان کے کان، آنکھ بھی ہیں تا کہ آدمی اپنی ضرورت ان سے پوری کر سکے۔ کیونکہ اگر یہ اندھے یا بہرے پیدا کیے گئے ہوتے تو انسان ان سے فائدہ نہ اٹھا سکتا اور نہ یہ اس کی کسی ضرورت میں کارآمد ثابت ہوتے۔

پھر یہ کہ ان کو ذہن اور عقل کا مادہ نہیں دیا گیا۔ تا کہ یہ آدمیوں کے مطیع رہیں اور جب وہ ان پر سخت مشقت ڈالے اور بھاری بوجھ لادے تو یہ اس سے سرکشی نہ کریں۔

اگر یہاں پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ انسان کے غلام بھی ہوتے ہیں اور وہ صاحب عقل ہونے کے باوجود اطاعت گزار اور فرمانبردار بھی ہوتے ہیں، محنت و مشقت کے کام بھی ان سے لیے جاتے ہیں۔ (اسی طرح اگر ان حیوانات کو بھی عقل و ذہن ملتا تو کیا ہرج تھا۔ جس طرح غلام اپنے آقاؤں کے مطیع و فرمانبردار رہتے ہیں، حیوانات بھی رہتے)۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اس قسم کے آدمی (جو غلامی کی سخت مشقت اٹھانے پر بھی مطیع و فرمانبردار ہی رہیں، چون و چرا نہ کریں) کم ہیں، لیکن اکثر آدمی (جو غلام ہیں) وہ چکی بھی پیستے ہیں وغیرہ وغیرہ اور جن کاموں کی آدمی کو ضرورت ہے ان میں جانوروں کو کوئی بہکائے بھی، تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ان حیوانات میں کسی کے بہکانے کا کچھ اثر پیدا ہو بخلاف انسان کے کہ اس میں اس بات کا بدیہی اثر ہے)۔

پھر اگر (حیوانات میں عقل پیدا کی گئی ہوتی اور وہ تکلیف برداشت نہ کرنے کے سبب آدمیوں کا کام نہ کرتے، ان کے فرمانبردار نہ رہتے) اور آدمی ان کاموں کو جنہیں حیوانات کرتے ہیں) خود ہی کرتا تو دوسرے کاموں سے معطل ہو جاتا، کیونکہ اسے ایک اونٹ یا ایک خچر کے بدلے بہت سے آدمی درکار ہوتے (جو ان کاموں کو انجام دے سکتے)۔ یہی معمولی کام تمام آدمیوں کو ہمہ وقت مصروف رکھتا، دیگر صنعت و حرفت سے انسان محروم ہو جاتا۔

علاوہ ازیں انسانوں کو ان کاموں سے سخت تعب بھی پہنچتا اور ان کے معاش میں مشقت اور تنگی ہو جاتی۔

لہٰذا حیوانات کو ان کی بار برداری وغیرہ کے لیے ایسا پیدا کیا کہ انہیں عقل وشعور نہ ہو، تا کہ انسان کے حکم سے سرتابی نہ کر سکیں۔

تین قسم کے حیوانات کی تشریح

مفضل! غور تو کرو، ان تین قسم کے حیوانات اور ان کی ساخت میں، کہ کیوں کر بنے ہیں اور ہر ایک کے لیے اس قسم کی ساخت سے کیا بہتری اور خوبی ہے؟

(اوّل) انسان

انسان کے لیے چونکہ یہ مقدر کر دیا گیا تھا کہ اس میں ذہن و ذکاوت ہو گی اور معماری، نجاری، زرگری، جامہ دوزی اور دیگر پیشے اور حرفتیں کرے گا۔ لہٰذا ان کی ہتھیلیاں بڑی بنائی گئیں جن میں موٹی موٹی انگلیاں ہیں تا کہ تمام چیزوں کی گرفت کرنے پر اچھی طرح قادر ہوں اور سب سے ضروری یہی مذکورہ بالا پیشے تھے (جو بغیر چوڑی ہتھیلیوں اور انگلیوں کی مدد کے ہو ہی نہ سکتے تھے)۔

(دوم) درندے

گوشت خور حیوانات کے لیے چونکہ یہ مقدر کر دیا گیا تھا کہ ان کی زندگی شکار کے ذریعے سے بسر ہو گی تو ان کی ہتھیلیاں لطیف، سمٹنے والی، پنجوں اور تیز ناخنوں دار بنائی گئیں، جو شکار کے تو لائق ہیں مگر صنعت وحرفت کے کام انجام نہیں دے سکتیں۔

(سوم) چرند

نباتات خور حیوانات کے لیے چونکہ یہ مقدر و معین کر دیا گیا تھا کہ نہ تو ان کے متعلق صنعت وحرفت کا کام ہو گا اور نہ شکار کا کام، لہٰذا بعض کو کھریاں دی گئیں جو انہیں زمین کی سختی

سے محفوظ رکھیں جبکہ وہ چلنے پھرنے اور چرنے کا کام کریں، اور کسی کو گول اور گھرے سم دیے گئے۔ جیسے چوپاؤں کے تلوے ہوتے ہیں جو زمین پر برابر پڑسکیں، تاکہ سواری اور بار برداری کے لیے عمدہ ثابت ہوسکیں۔

درندوں کی تشریح

گوشت خور جانوروں کی ساخت اور بناوٹ پر غور کرو کہ ان کے تیز دانت اور سخت نوکیلے اور تیز پنجے اور چوڑے دہانے (منہ) پیدا کیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے یہ مقدر کر دیا گیا ہے کہ گوشت ہی ان کی غذا ہو تو ان کی ساخت بھی اس کے مناسب ہی بنائی گئی اور ان کو ایسے ہتھیاروں اور آلات سے مدد دی گئی جو شکار کے قابل ہوں۔

علی ہذا القیاس، تم شکاری، پرندوں کو بھی پاؤ گے، کہ ان کی چونچ اور پنجے ان کے کام کے قابل بنائے گئے ہیں۔

اگر یہی پنجے، وحوش (غیر شکاری) جانوروں کو دیے جاتے تو ان کے لیے بیکار ثابت ہوتے۔ کیونکہ نہ تو وہ شکار کرتے ہیں اور نہ گوشت کھاتے ہیں اور اگر درندوں کو کھر (بجائے پنجوں کے) دیے جاتے تو جن چیزوں کی انہیں ضرورت تھی وہ انہیں نہ ملتیں یعنی وہ ہتھیار جن سے شکار کر کے اپنی زندگی بسر کرسکیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان دونوں قسم کے حیوانات کو وہی چیزیں ملی ہیں جو اس قسم کے لیے مناسب اور اس کے موافق ہیں، بلکہ انہیں سے ان کی زندگی ہے۔

اب چوپائے جانوروں کو دیکھو، کہ وہ کس طرح اپنی ماؤں کے پیچھے پیچھے خود بخود چلتے ہیں۔ اٹھانے کی ان کو ضرورت نہیں، پرورش کی ان کی ضرورت نہیں، جیسا کہ آدمیوں کے بچوں کو ضرورت ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان بچوں کی ماؤں کے پاس وہ آلات نہیں ہیں جو آدمی کے بچوں کی ماؤں کے پاس ہیں۔ مثلاً نرمی و لطف اور پرورش کا علم اور ان بچوں کو ہاتھ

اور انگلیوں کے ذریعے سے اٹھانے کی قوت جو اسی لیے بنائے گئے ہیں (یہ باتیں بیچارے چوپاؤں میں نہیں ہیں) لہٰذا ان چوپائے بچوں کے لیے یہ قرار دیا گیا کہ وہ خود ہی اٹھیں اور اپنا کام بھی خود ہی کریں۔

اسی طرح دیگر پرندوں میں بھی پاؤ گے۔ جیسے مرغی، تیتر، کبک کے بچے اسی وقت چلنے پھرنے اور دانہ چگنے لگتے ہیں (جبکہ وہ انڈوں سے نکلتے ہیں) لیکن وہ پرندے جو کمزور ہیں اور ان میں اٹھنے کی طاقت نہیں، جیسے دیسی اور جنگلی کبوتر اور خُمر کے بچے۔ تو ان کی ماؤں کو ان کی بہت ہی محبت دی گئی ہے کہ جب وہ اپنے پوٹوں کو بھر لیتی ہیں تو ان بچوں کے منہ میں لا کر بھراتی ہیں اور برابر کھلاتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ (بچے) اپنا کام انجام دے سکیں۔

اسی وجہ سے کبوتر کو بہت سے بچے نہیں دیے گئے۔ جیسے مرغیوں کے بہت سے بچے ہوتے ہیں تاکہ ان کی مائیں اپنے بچوں کے پالنے پر قادر ہو سکیں اور وہ بچے خراب اور ہلاک نہ ہوں۔ پس حکیم لطیف وخبیر کی حکمت کا ہر ایک کو ایک حصہ ملا ہے۔

حیوانات کی ٹانگیں جُفت کیوں بنائیں؟

دیکھو! حیوانات کی ٹانگیں کیوں کر جفت بنائی گئی ہیں؟

یہ اس لیے کہ چلنا پھرنا ممکن ہو۔ اگر طاق بنائی گئی ہوتیں تو اس (حیوان) کے قابل نہ ہوتیں۔ اس سبب سے کہ چلنے والے جاندار اپنے ایک پاؤں کو اٹھاتے اور دوسرے پر سہارا لیتے ہیں۔ دو ٹانگوں والے ایک کو اٹھاتے دوسری پر ٹھہرتے ہیں۔ اور چار ٹانگوں والے دو کو اٹھاتے اور دو پر سہارا لیتے ہیں اور یہ مختلف رخ سے ہوتا ہے کیونکہ اگر چوپائے دونوں ٹانگیں ایک ہی طرف کی اٹھاتے اور دوسری طرف کی دو ٹانگوں پر سہارا لیتے تو زمین پر نہ رک سکتے۔ جیسے تخت، چارپائی وغیرہ صرف دو پایوں پر رک نہیں سکتے۔ تو ایسا ہوا کہ دہنی طرف کی اگلی ٹانگ کو اٹھائے اور بائیں طرف کی پچھلی، اور اسی طرح مخالف جہت سے باقی ٹانگوں کو اٹھائے تاکہ

زمین پر قائم رہ سکے اور چلنے کے وقت گر نہ پڑے۔

اطاعت گزار چوپائے

کیا تم گدھے کو نہیں دیکھتے کہ؟ کیوں کر بار برداری کا کام کرتا ہے اور وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ خچر اس سے زیادہ کام کرتا ہے لیکن گھوڑا آرام و آسائش میں رکھا جاتا ہے۔

اور اونٹ تو اس قدر کام کرتا ہے کہ جتنا کئی آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حکم نہ مانتا تو کیسا ہوتا؟ اب تو وہ ایک بچے کی بھی اطاعت کر لیتا ہے۔

اور بیل! کیوں کر اپنے مالک کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ یہاں تک اس کی گردن پر جوا رکھ کر اس کے ذریعے سے زراعت کرتا ہے۔

شریف نسل کا گھوڑا، تلواروں اور نیزوں میں اپنے مالک کی طرح گھس جاتا ہے۔ (اپنی جان کا خوف نہیں کرتا)

بھیڑ کے ایک پورے گلے کو صرف ایک آدمی چرا لیتا ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ بھیڑیں ادھر ادھر بھاگ جایا کرتیں اور ہر ایک ان میں الگ راستہ اختیار کرتی تو ایک شخص ان کے لیے ناکافی ہوتا۔

علیٰ ہذا القیاس اور تمام قسم کے حیوانات جو انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اسی سبب سے نا، کہ ان میں عقل نہیں۔ غور فکر کی قوت نہیں، اگر ان میں عقل ہوتی اور یہ اپنے اپنے کاموں میں غور کرتے ہوتے تو یقیناً آدمی کی ضروریات کے وقت پہلو تہی اور نافرمانی کر جایا کرتے۔ اونٹ اپنے ساربان کا حکم نہ مانتا، نہ بیل اپنے مالک کا۔ اور بھیڑیں اپنے چرواہے سے بھاگ کر متفرق ہو جایا کرتیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔

اسی طرح یہ درندے اگر عقل وشعور رکھتے ہوتے تو آدمیوں سے عقلندوں کی طرح

مقابلہ کرتے اور ان سے جھگڑتے (کہ تم ہماری خوراک کی چیزوں پر کس طرح قابض ومتصرف ہونا چاہتے ہو)۔ شیر، بھیڑیے، چیتے اور ریچھوں وغیرہ سے کون مقابلہ کرسکتا تھا۔ اگر وہ بھی آپس میں مل جل کر آدمیوں پر چڑھائی کردیتے تو ان کے پاس بچنے کی کون سی راہ ہوتی؟

کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ یہ بات ان سے کیوں کر روک دی گئی اور بجائے اس کے کہ ان سے انسان ڈرتا ہے اور وہ خود بھی آدمیوں سے خائف رہتے اور بھاگتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ دن میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لیے نہیں نکلتے، رات کو نکلا کرتے ہیں۔ تو باوجود ہیبت وقوت کے بے روک ٹوک اور بغیر مار پیٹ آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ان کے گھروں میں کود پھاند کر داخل ہو جاتے اور ان کی زندگی تنگ کردیتے۔

کتے کی حالتیں

پھر منجملہ ان تمام درندوں کے کتے میں ایک خاص بات رکھی گئی ہے کہ اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے اور اس کی حمایت وحفاظت کرتا ہے۔ اور اس کے گھر کی بھی حفاظت کے واسطے مکان کی چہار دیواری اور چھتوں وغیرہ پر اندھیری رات میں گھومتا پھرتا رہتا ہے چوروں سے بچاتا ہے، دوسرے کتے کو بھی نہیں آنے دیتا۔ اس کی محبت اپنے مالک سے اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ خود اس کے اور اس کے گلے اور مال کے بچانے کے واسطے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے اور اس سے بیحد محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ بھوک اور تکلیف پر صبر کرتا ہے۔ تو کتا کیوں ایسا پیدا کیا گیا، اسی لیے نا، کہ آدمی کی حفاظت کرے۔ ''اس کے دانت سخت ہیں، اس کے پنجے تیز اور نوکیلے ہیں، اس کی آواز ڈراؤنی ہے۔'' ایسا کیوں ہے؟

اسی لیے نا، کہ چور اس سے ڈر جائے، اور جن چیزوں کی وہ حفاظت کرتا ہے ان کے پاس کوئی نہ پہنچ سکے۔

چوپاؤں کے چہروں کی کیفیت

مفضل! چوپاؤں کے چہروں کی طرف غور کرو۔ کیوں کر بنائے گئے ہیں؟ تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں سامنے کو لگی ہوئی ہیں تاکہ کسی دیوار سے نہ ٹکرا جائیں یا کسی گڑھے میں نہ گر پڑیں اور ان کے دہانوں کو تھوتھنی کے نیچے سے پھٹا ہوا پاؤ گے۔ اگر اس طرح پھٹے ہوتے جیسے انسانوں کے منہ ہیں، ٹھوڑی کے سامنے سے تو وہ اس پر قادر نہ ہوتے کہ زمین سے کوئی چیز اٹھا سکتے وغیرہ۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی اپنے منہ سے کھانے کی چیز کو نہیں اٹھاتا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اٹھاتا ہے۔ یہ اس کو خاص شرافت دیگر کھانے والوں پر دی گئی ہے اور چونکہ چوپاؤں میں ایسے ہاتھ نہیں ہیں جن سے وہ گھاس وغیرہ اٹھا کر کھا سکیں۔ لہٰذا ان کا تھوتھنی کا حصہ نیچے کی جانب شگافتہ بنایا گیا، تاکہ گھاس کو آسانی پکڑ سکیں اور پھر اسے چبا سکیں (اور لمبے ہونٹوں سے مدد لے)۔

حیوانات کی دم کیوں بنائی گئی؟

ان جانوروں کی دم کو عبرت سے دیکھو! کہ اس میں کیا نفع قرار دیا گیا ہے۔ یہ ان کے بول و براز (پیشاب پاخانہ) کے مقامات کے لیے ایک قسم کا ڈھکنا ہے جو دونوں کی ستر پوشی کرے۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کے جسم پر مکھیاں اور مچھر وغیرہ نہ جمع ہو سکیں۔ تیسرے فائدہ یہ ہے کہ ان کو دائیں بائیں دم کے ہلاتے رہنے سے آرام بھی ملتا ہے (گویا یہ ان کا ایک قسم کا مشغلہ ہے) اس لیے کہ، چونکہ یہ جانور اپنے اپنے چاروں ہی پیروں پر کھڑے رہتے ہیں اور اگلے دونوں پاؤں بدن کو اٹھائے رہنے میں مصروف رہتے ہیں اور انہیں ادھر ادھر پھرانے کا موقع نہیں ملتا، تو ان کو اپنی دم ہلانے میں راحت ملتی ہے اور اس میں بہت سے دیگر فائدے بھی ہیں جن کے جاننے سے ہم قاصر ہے جو اسی وقت معلوم ہوتے ہیں

جب اس کی ضرورت پڑے۔

منجملہ ان فائدوں کے چوتھا فائدہ یہ بھی ہے، کہ جانور کبھی دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اس کے نکالنے اور اٹھانے کے لیے دم سے بڑھ کر کوئی چیز کام نہیں دے سکتی۔

اور دم کے بالوں میں آدمیوں کے بھی بہت سے فائدے ہیں کہ انہیں اپنی ضرورتوں میں صرف کرتے ہیں۔

پھر ان حیوانوں کی پیٹھ مسطح اور چاروں ٹانگوں کے اوپر اوندھی ہوئی بنائی گئی تا کہ اس پر سوار ہونا یا بار برداری آسان ہو۔ ان کے مقام دخول (شرمگاہ) ان کے پیچھے کھلے ہوئے بنائے گئے، تا کہ نر کو جفتی کھانا ممکن اور آسان ہو۔ اور اگر پیٹ کے نیچے بنایا جاتا جیسے عورت کی شرمگاہ ہے تو ان کے نروں کو جفتی کرنا ممکن نہ ہوتی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ان کے نر منہ کے سامنے سے جفتی نہیں کھا سکتے جس طرح کوئی مرد، عورت سے صحبت کر سکتا ہے۔

ہاتھی کی سونڈ کے فوائد

ہاتھی کی سونڈ کو غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کیا باریک حکمت ہے؟ یہ سونڈ اس کے لیے چارہ اور پانی لینے اور پیٹ تک پہنچانے میں ہاتھ کے قائم مقام ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہاتھی کسی چیز کو زمین سے نہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی گردن دوسرے چوپاؤں کی طرح لمبی نہیں ہوتی کہ اردگرد حرکت کر سکے، اسی وجہ سے سونڈ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا، اور لمبی سونڈ ہونے کے باعث اس کو لٹکائے رہے اور اپنی ضروریات پوری کر سکے...... تو کس نے بجائے اس عضو معدوم (ہاتھ و گردن) کے اسے ایسی چیز دی جو اس کا بدلہ ہو سکے۔ اسی نے نا، جو اپنی مخلوقات پر نہایت مہربان ہے اور یہ بغیر پیدا کیے کیوں کر ہو سکتا تھا جیسا کہ یہ ظالم نیچری اور دہریے کہتے ہیں۔

پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ پھر اس کی گردن ویسی ہی کیوں نہ بنائی جیسی دیگر

چوپاؤں کی ہے تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ ہاتھی کا سر اور اس کے کان بہت بھاری اور ثقیل ہیں۔ اگر یہ سر اور کان لمبی گردن پر بنائے گئے ہوتے تو اسے توڑ دیتے اور سست کر دیتے۔

لہٰذا اس کا سر اس کے دھڑ (جسم) سے ملا ہوا بنایا گیا۔ تاکہ اسے وہ تکلیف نہ پہنچے جو ہم نے بیان کی ہے اور بجائے اس کے یہ سونڈ بنا دی گئی تاکہ اس کے ذریعے سے اپنی غذا حاصل کر سکے۔

پس باوجود گردن نہ ہونے کے یہ تمام ان چیزوں کو پوری طرح حاصل کر لیتا ہے جس میں اس کی ضرورت رفع ہو جائے۔

دیکھو ہتھنی (مادہ ہاتھی) کی فرج کیونکر پیٹ کے نیچے بنائی گئی ہے مگر جب اسے شہوت ہوتی ہے تو اوپر کی جانب ابھر آتی ہے، تاکہ نر کو اس سے جفتی کھانے میں آسانی ہو۔

غور کرو! کہ ہتھنی کی شرمگاہ برخلاف اور حیوانوں کے بنائی گئی ہے پھر اس میں وہ بات رکھ دی گئی جس سے وہ امر ممکن ہو سکے جس میں اس کی نسل کی بقائے دوام ہے۔

زرافہ کی ساخت

زرافہ کی ساخت کو ذرا غور کرو اور اس بات کو، کہ اس کے اعضاء کیسے مختلف ہیں اور چند طرح کے حیوانوں کے اعضاء سے مشابہ ہیں۔ اس کا سر گھوڑے جیسا، گردن، اونٹ کی طرح کھریاں گائے جیسی اور کھال چیتے کی طرح۔

بعض جاہلوں نے یہ گمان کیا ہے (جن کو خدائے تعالیٰ حکمتوں کی معرفت نہیں) کہ مختلف اقسام کے نروں کی جفتی سے اس طرح کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ان جاہلوں نے یہ بیان کیا ہے کہ خشکی کے قسم قسم کے جانور جب پانی پینے کے لیے گھاٹوں پر جاتے ہیں تو کوئی جانور کسی سے، کوئی کسی سے جفتی کھا جاتا ہے تو اس صورت کا بچہ پیدا ہو جاتا ہے جو مختلف قسم کے حیوانات کا گویا کہ ایک نمونہ ہے۔ یہ اس کہنے والے کی جہالت ہے اور یہ خدائے جل قدسہٗ وعز جلالہ کو

پہچانتا ہی نہیں۔

کسی قسم کا جانور دوسری قسم کے جانوروں سے جفتی نہیں کھاتا۔ نہ گھوڑا، اونٹنی سے اور نہ اونٹ گائے سے وغیرہ۔ جفتی تو صرف ان جانوروں میں باہم ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے مشاکل و مشابہ ہوں۔ جیسے گھوڑا گدھی سے جفتی کھاتا ہے۔ جس سے خچر پیدا ہوتا ہے اور بھیڑیا، بجو سے جفتی کھاتا ہے جس سے سمع پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اگر کوئی بچہ ان کی جفتی سے پیدا ہو تو ایک ایک عضو ہر ایک جانور کے مشابہ ہو۔ (مثلاً، سر تو بجو جیسا ہو اور باقی جسم بھیڑیے جیسا ہو) جیسا کہ زرافہ میں ہے کہ ایک عضو تو گھوڑے کا ہے اور ایک عضو اونٹ کی طرح اور کھریاں گائے جیسی۔ بلکہ ان دونوں سے مل کر ایک تیسری قسم کا جانور بن جاتا ہے۔ جیسے تم خچر کو دیکھتے ہو کہ اس کا سر اس کے کان، اس کی پشت (پیٹھ)، اس کی دم، اس کے سُم گدھے اور گھوڑے کے ان اعضاء کے بین بین ہیں۔ اور اس کی آواز گھوڑے کی طرح (ہنہناہٹ) اور گدھے کی آواز کے بین بین ہے۔

پس یہی اس بات کی دلیل ہے کہ زرافہ مختلف جانوروں کی باہم جفتی کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے یہ بھی ایک عجیب مخلوق ہے جس سے اس کی قدرت معلوم ہو جو کسی چیز میں عاجز نہیں۔

یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ قسم قسم کے حیوانات کا خالق جس کے جس عضو بدن کو چاہتا ہے ایک سا پیدا کرتا ہے اور جس کے اعضائے بدن کو چاہتا ہے مختلف پیدا کرتا ہے۔ بناوٹ میں جو چاہتا ہے زیادتی کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس سے اس کی قدرت معلوم ہو اور یہ کہ اسے کوئی ایسی چیز جس کا وہ ارادہ کرے عاجز نہیں کر سکتی۔

زرافہ کی گردن اس قدر لمبی کیوں ہے اور اس میں اسے کیا فائدہ ہے۔ تو وہ فائدہ یہ

ہے کہ اس کی چراگاہ اور اس کی پیدائش کی جگہ درختوں کے جھنڈ میں ہے جہاں اونچے اونچے، لمبے لمبے درخت پیدا ہوتے ہیں تو اسے لمبی گردن ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے منہ سے درختوں کی پتیاں توڑ سکے اور اس کے پھلوں سے اپنی غذا بنا سکے۔

بندر کی ساخت

بندر کی پیدائش اور اس کے اعضاء اکثر و بیشتر آدمی کے اعضاء سے مشابہ ہونے پر غور کرو۔ یعنی سر، دونوں شانے اور سینہ اور اسی طرح اس کے باطنی اعضاء بھی انسان کے باطنی اعضاء سے مشابہ ہیں۔ علاوہ بریں اسے ذہن و ذکاء بھی دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اپنے پالنے والے کی ان باتوں کو سمجھتا ہے جس کا وہ اشارہ کرتا ہے اور اکثر انسان کو جو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے یہاں تک کہ انسانی خصلت اور اس کے شمائل و خصائل سے اپنی تدبیر ساخت میں بہت قریب ہے اور آدمی کے لیے باعث عبرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھے کہ میں بھی بہائم کی طینت اور مادے سے بنا ہوں، کیونکہ انہیں بہائم میں سے وہ بھی ہے جو انسان سے اس قدر قریب ہے اور یہ کہ اگر مجھ کو ذہن و عقل و گویائی میں اس پر فضیلت نہ دی جاتی تو میں بھی کسی جانور ہی کے مانند ہوتا۔

علاوہ اس کے بندر کے جسم میں کچھ اضافہ بھی ہے جن کی وجہ سے اس میں اور انسان میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً دہانہ (منہ)، دم اور بال جو اس کے جسم کا لباس ہیں۔ اور یہ باتیں انسان سے اس کے ملحق اور مشابہ ہو جانے سے مانع نہ ہوتیں اگر اس کو انسان ہی کے مانند عقل، ذہن اور گویائی کی طاقت دی گئی ہوتی۔ پس صحیح حد فاصل اس میں اور آدمی میں، صرف عقل، ذہن اور طاقت گویائی کی کمی ہے۔

چوپاؤں کو ضروریات زندگی کی فراہمی

اے مفضل! ذرا اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان بہائم پر دیکھو کہ ان کے بدنوں کو مختلف قسم

کے بالوں کا کیسا لباس پہنایا ہے تاکہ سردی اور آفتوں کے زیادہ پڑنے سے محفوظ رہیں اور انہیں (بجائے جوتے کے) کھریاں، سم اور خف (اونٹ اور ہاتھی جیسے پاؤں ہیں) دیے تاکہ گھسنے سے بچیں کیونکہ ان کے نہ تو ہاتھ ہی ہیں، نہ ہتھیلیاں اور نہ انگلیاں جن سے آدمی کی طرح کوئی کام کر کے اپنے جسم کی حفاظت کرسکیں، ان کا لباس ان کی ساخت و بناوٹ اور خلقت ہی میں بنا دیا گیا ہے۔ جو ان کی زندگی تک باقی رہے اور انہیں اس کی تجدید اور بدلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مگر انسان تو صاحب تدبیر ہے اس کے پاس ہتھیلیاں اور انگلیاں، نیز عقل وفہم وغیرہ موجود ہے جن سے کام کرسکتا ہے۔ وہ کپڑا بنتا ہے اور سوت بھی کاتتا ہے اور اسی سے اپنے لیے کپڑا بناتا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے تبدیل بھی کرتا رہتا ہے اور اس کے لیے اس میں کئی طرح کی بہتری ہے۔ منجملہ ان تمام کاموں کے یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہو کر فضول باتوں سے بچتا ہے۔ وغیرہ، علاوہ ازیں جب چاہتا ہے اپنے کپڑے اتار کر آرام حاصل کرتا ہے۔ اپنے لباس کو اپنی صنعت کے ذریعے سے خوشنما اور عمدہ تیار کرتا ہے جوتے اور دیگر اقسام کی صنعت و حرفت کرتا ہے جن میں اس کے اور دوسروں کے واسطے معاش اور تجارت بھی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس بہائم وغیرہ کے لیے ان تمام باتوں کا نعم البدل ان کے بال، سم اور کھریاں وخف وغیرہ میں رکھا گیا ہے۔

چوپاؤں کے مُردوں کی حالت

مفضل! ذرا اس عجیب خلقت کو غور کرو جو بہائم میں بنائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام بہائم جب مر جاتے ہیں تو اپنے مُردوں کو اس طرح چھپا دیتے ہیں جیسے انسان اپنے مردوں کو دفن کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ان کے مردے کیا ہوتے ہیں جو ایک بھی دکھائی نہیں دیتا، اور ایسے کم تعداد میں بھی نہیں ہیں کہ پوشیدہ رہتے ہین بلکہ اگر ان کو آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

اسے، ان ہرنوں، جنگلی گائے، بیلوں، گدھوں، جنگلی بکریوں اور بارہ سنگھوں کے گلوں کے ذریعے سے سمجھو اور نیز وہ وحوش اور مختلف طرح کے درندے، شیر، بجو، بھیڑیے، چیتے اور مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض اور زمین پر چلنے والے دوسرے جانوروں سے سمجھو اور عبرت حاصل کرو جو صحراؤں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس پرندوں کے جتھے، مثلاً کوے، چکور، کلنگ بط، کبوتر اور تمام شکاری پرندوں سے عبرت لو۔ ان سب کے مردے کہیں دکھائی نہیں دیتے، مگر وہی ایک آدھ جسے شکاری شکار کر لیتا ہے یا درندے پھاڑ کھاتے ہیں۔ (دراصل ہوتا یہ ہے کہ) جب ان حیوانات کو اپنے مرنے کا احساس ہوتا ہے تو کسی مخفی مقام میں چھپ جاتے ہیں اور وہیں مر جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو تمام زمین ان کے مردوں ہی سے بھر جاتی۔ یہاں تک کہ ہوا میں بدبو پیدا ہو جاتی اور طرح طرح کی بیماریاں اور وبائیں پھیل جاتیں۔ غور کرو اس بات پر جو انسان نے حیوانات ہی سے حاصل کی اور اس پہلی تمثیل (جسے خدائے تعالیٰ نے ہابیل و قابیل کے قصے میں بیان کیا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو دیکھا کہ دو کوے لڑتے ہوئے آئے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور زمین کھود کر اسے دفن کر دیا۔ اس سے قابیل نے سیکھا کہ ایک گڑھا کھودا جائے اور اس میں اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیا جائے) پر عمل کیا جسے پروردگار نے اس کے لیے قائم کیا تھا۔

جانوروں میں اِدراک

کس طرح اس مدبر عالم نے ان بہائم وغیرہ میں یہ ادراک اور طبیعت (قانون فطرت) قرار دی ہے جس کی وجہ سے آدمی ان امراض اور فسادات کی ایذا سے بچ گیا جو اس پر وارد اور واقع ہوتے۔

مفضل! ان سمجھداریوں پر غور کرو جو ان بہائم میں قرار دی گئی ہیں اور قدرتی طور پر

اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کی خلقت میں داخل ہیں۔ تا کہ اس کی مخلوق ان نعمتوں سے محروم نہ رہے، مگر یہ سمجھ، عقل اور قوت مفکرہ کے ساتھ نہیں ہے (جس کی پہلے نفی کی گئی ہے)۔

دیکھو کہ گوزن (نیولہ)، سانپ کو کھا جاتا ہے اور اس وجہ سے اسے سخت پیاس لگتی ہے۔ مگر پانی نہیں پیتا اس خوف سے کہ اگر اس نے پانی پی لیا تو زہر اس کے تمام جسم میں سرایت کر جائے گا اور اسے ہلاک کر دے گا۔ تالابوں کے کنارے کھڑا رہتا ہے اور اس کو پیاس سے سخت تکلیف ہوتی ہے تو بلند آواز سے چیختا ہے مگر پانی نہیں پیتا اگر پی لے تو اُسی دم مر جائے۔

تو دیکھو! کہ بالطبع ان جانوروں میں سخت پیاس کے روک لینے کی اپنے ضرر کے خوف سے کس قدر برداشت رکھی گئی ہے۔ حالانکہ یہ ایسی چیز ہے کہ باعقل و تمیز آدمی بھی خود اسے ضبط نہیں کر سکتا۔

لومڑی (کو دیکھو کہ) جب اسے خوراک نہیں بہم پہنچتی تو اپنے تئیں مردہ بنا لیتی ہے اور اپنا پیٹ پھُلا لیتی ہے اس لیے کہ پرندے اسے مردہ سمجھیں اور جونہی پرندے اس کو نوچنے اور کھانے کے لیے اس پر گرتے ہیں فوراً ان پر حملہ کرتی اور پکڑ لیتی ہے۔

پھر بتاؤ! کہ بے زبان اور بے ادراک لومڑی کو یہ تدبیر کس نے بتائی؟ اُسی نے نا، جو ان طریقوں سے اسے روزی پہنچانے کا ذمہ دار ہوا ہے۔ چونکہ لومڑی اکثر ان امور کو نہیں کر سکتی جنہیں درندے کرتے ہیں۔ مثلاً شکار کا مقابلہ کرنا، ان پر حملہ کرنا وغیرہ۔ تو اسے اس چالاکی اور حیلہ گری سے اس کے معاش کے لیے مدد پہنچائی گئی ہے۔

مچھلی ڈلفن (ڈالفن) جو آبی جانوروں اور ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچا لیتی ہے) پرندوں کا شکار چاہتی ہے تو اس کی اس معاملے میں یہ تدبیر ہوتی ہے کہ پہلے مچھلی کو پکڑ کر مار ڈالتی ہے تا کہ وہ پانی پر اُبھری رہے اور خود اس کے نیچے چھپی رہتی ہے اور پانی کو اچھالتی رہتی

ہے کہ کہیں اس کا جسم نہ دکھائی دے، جب کوئی پرندہ اس مری ہوئی مچھلی پر گرتا ہے تو اسے اُچک کر شکار کرلیتی ہے۔

مفضل کہتے ہیں! میں نے عرض کی کہ مولیٰ، اژدہے اور بادل کا کچھ حال بیان فرمایئے۔

آپؑ نے ارشاد فرمایا: ابر گویا اس پر موکل کیا گیا ہے کہ جہاں اسے پائے اُچک لے۔ جیسے سنگ مقناطیس لوہے کو جذب کرلیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنا سر زمین سے اٹھاتا ہی نہیں، کیونکہ اسے ابر کا خوف لگا رہتا ہے اور سوائے گرمی کے دنوں کے، جبکہ آسمان صاف ہو اور ابر کا ایک نقطہ بھی اوپر نہ ہو، باہر آتا ہی نہیں اور وہ بھی صرف ایک مرتبہ نکلتا ہے۔

مفضل کہتے ہیں، میں نے عرض کی، تو ابر کیوں اژدہے پر موکل کیا گیا، جو اس کی گھات میں رہتا اور جہاں اسے پائے اُچک لیتا ہے؟

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ''اس لیے کہ آدمیوں کو اس کے ضرر سے بچائے۔''

مفضل کہتے ہیں، میں نے عرض کی مولیٰ! آپؑ نے بہائم وحیوانات کا تو ایسا حال بیان فرمادیا، جو عبرت حاصل کرنے والوں کے عبرت ہوسکے۔ اب آپؑ چیونٹی، چیونٹے اور پرندوں کا حال بیان فرمایئے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اے مفضل! سنو! اس ننھی سی چیونٹی کے منہ کو دیکھو، کیا اس میں کسی ایسی بات کی کمی پاتے ہو جس کی بہتری اور بھلائی نہ ہو اور جو اس کے مناسب نہ ہو؟ یہ اندازہ اور صواب کہاں سے آیا؟ سوائے اس کے کہ وہی حکمت وتدبیر اس میں بھی صرف ہوئی ہے جو بڑی مخلوق اور چھوٹی مخلوق میں ہوئی ہے (اسی وجہ سے جتنی چیزیں چیونٹی کے لیے ضروری ہوسکتی تھیں سب ہی اس کے واسطے پیدا کردی گئیں)۔

دیکھو! اس چیونٹی کو کہ اپنی غذا کے جمع کرنے کے لیے کیوں کر مجتمع اور اکٹھا ہوتی

ہے۔ تم ایسا دیکھو گے کہ کئی کئی چیونٹیاں جب کسی دانے کو اپنے سوراخ میں پہنچانا چاہتی ہیں تو ایسی ہوتی ہیں جیسے چند آدمی مل کر غلے وغیرہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ بلکہ چیونٹی کو اس بارے میں تو اتنی کوشش اور تندہی ہوتی ہے کہ آدمی ویسا نہیں کر سکتے۔

کیا تم دیکھتے نہیں کہ دانہ حاصل کر کے ان کے درمیان سے دو ٹکڑے کر دیتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو (یہ دانے ان سوراخوں میں پانی پا کر اُگ آئیں اور ان کے کام کے نہ رہیں۔ اور جب ان دانوں کو تری پہنچ جاتی ہے تو ان کو نکال کر پھیلا دیتی ہے، تا کہ خشک ہو جائیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ چیونٹیاں ایسے مقام پر اپنا سوراخ بناتی ہیں جو بلند ہو تا کہ پانی کی رو وہاں تک پہنچ کر انہیں غرق نہ کر دے۔ مگر یہ سب باتیں بغیر عقل و فکر کے ہیں۔ اور ایک فطری اور قدرتی باتیں ہیں جو ان کی مصلحت کے واسطے خدائے عزوجل کی مہربانی سے ان کی خلقت میں داخل کر دی گئی ہیں۔

اس جاندار کو دیکھو جسے لَیث (شیر) کہتے ہیں اور عام لوگ اس کو اسدالذباب (مکھیوں کا شیر)۔ یہ ایک قسم کی مکڑی ہے جو مکھیوں کا شکار کرتی ہے۔ کیسی تدبیر اور حیلہ گری، اس کو اپنی تحصیل معاش کے لیے رفق اور ملائمت دی گئی ہے؟

تم دیکھو گے کہ جب اسے مکھی کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے قریب آئی، تو دیر تک اسے چھوڑے رکھتی ہے (بالکل اس سے تعرض نہیں کرتی اور نہ چال چلتی، نہ شکار کا ارادہ ظاہر کرتی ہے) گویا خود ایک مردہ چیز ہے جس میں کچھ حس و حرکت ہی نہیں، جب مکھی کو مطمئن پاتی ہے اور خود سے اس کو غافل دیکھتی ہے تو نہایت آہستہ آہستہ رساں رساں اس کی طرف چلتی ہے جس وقت اتنی قریب پہنچ جاتی ہے کہ اسے پکڑ سکے گی تب اس پر جست لگا کر پکڑ لیتی ہے اور پھر اس طرح اپنے تمام جسم سے اس کے ساتھ چمٹتی ہے کہ کہیں چھوٹ نہ جائے اور اتنی دیر تک اس کو مضبوط تھامے رہتی ہے کہ اسے محسوس ہو جاتا ہے کہ مکھی اب کمزور ہو گئی ہے، اور

ہاتھ پاؤں اس کے ڈھیلے ہو گئے، پھر متوجہ ہوتی ہے اور اسے کسی محفوظ مقام پر لے جا کر اپنی غذا بناتی ہے اور اسی کے ذریعے سے اس کی حیات ہے۔ (اب بتاؤ! کہ یہ تدبیر مکڑی کو کس نے بتائی کہ اس حیلہ گری کو کام میں لائے اور مکھی کو شکار کر کے اپنی غذا بنائے؟

کیا مکڑی کے مادے نے اسے سکھایا، یا اس کی بغیر ادراک طبیعت نے۔ ہرگز نہیں، بلکہ کسی بڑے مدبر حکیم نے جس نے اسے پیدا کیا ہے، یہ ترکیب و تدبیر اس کی خلقت میں ودیعت فرمائی ہے)۔

لیکن باقی (عام) مکڑی، تو وہ جالا تنتی اور اسے مکھیوں کے شکار کا جال اور پھندا بناتی ہے اور خود اس کے اندر چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ جونہی مکھی اس میں پھنستی ہے اس کو لپک کر دَم بدم کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی ہے۔

اسی طرح لوگ شیر وغیرہ کے شکار کے لیے جال اور پھندے کے صید کا بھی بیان کرتے ہیں۔ (یعنی جو تدبیر انسان اپنی عقل سے شکار کے لیے اختیار کرتا ہے مکڑی بھی باوجود بے عقل و ادراک ہونے کے محض اپنی فطرتی اور قدرتی ودیعت شدہ قوت سے وہی تدبیر اختیار کرتی ہے)۔

تو دیکھو! اس کمزور جانور کی طبیعت میں کیوں کر وہ بات رکھی گئی ہے جسے انسان بغیر حیلہ و تدبیر اور استعمال آلات نہیں کر سکتا! تم کسی چیز کو عیب نہ لگاؤ جب کہ کوئی اثر عبرت موجود ہو۔ جیسے چیونٹی، چیونٹے وغیرہ (یعنی ان کو حقیر نہ سمجھو)۔ (اس کلام سے حضرت کا مقصود یہ ہے کہ چیونٹی وغیرہ چھوٹی چھوٹی مخلوقات خدا کو حقیر نہ سمجھو، ان میں بھی عجیب و غریب حکمتیں اور صناعیاں (صنعتیں) ہیں جو ان کے خالق نے ان میں ودیعت فرمائی ہیں جن سے انسان غور کرنے کے بعد بڑی بڑی عبرتیں حاصل کر سکتا ہے۔) کیونکہ کبھی کسی نفیس مطلب کی مثال ایسی حقیر اور چھوٹی چیز سے بھی دی جاتی ہے تو اس سے اس نفیس مطلب کی قدر کچھ کم نہیں ہو جاتی۔

جیسے سونا، لوہے کے باٹ سے (یا پیتل کے باٹ سے) تولا جاتا ہے تو اس تولنے سے سونے کی قدر و قیمت کم نہیں ہو جاتی۔

پرندوں کی پرداخت

اے مفضل! پرندوں کے جسم اور ان کی بناوٹ پر غور کرو، چونکہ ان کے لیے یہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ فضائے آسمان میں اڑا کریں، اس لیے ان کے اجسام ہلکے اور سمٹے ہوئے بنائے گئے، چار پیروں کے بدلے صرف دو پیر انہیں دیے گئے اور پانچ انگلیوں کے بدلے صرف چار، اور پیٹ اور پیشاب کے دو سوراخوں کے بدلے صرف ایک سوراخ جو دونوں کام دے سکتا ہے۔ پھر اس کو سینہ تیز (اور باریک) دیا گیا کہ اس طرف کی ہوا کو کاٹ سکے جدھر جانا چاہے جیسا کہ کشتی بنائی جاتی ہے جسے پرندے کی صورت پر بنایا گیا ہے تاکہ پانی کو آسانی کاٹ سکے اور اس پر چل سکے۔

پرندے کے بازوؤں اور دم میں لمبے لمبے مضبوط پر پیدا کیے گئے تاکہ ان کے ذریعے سے اڑنے کے لیے بلند ہو سکے اور تمام بدن پروں سے ڈھانپ دیا گیا، تاکہ اس کے اندر ہوا بھر کر اسے بلند کرے۔ اور چونکہ اس کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ غذا اس کی دانے اور گوشت سے ہوگی جسے وہ بغیر چبائے صرف نگل جائے۔ تو اس کی خلقت میں سے دانت کم کر دیے گئے اور سخت چونچ ٹٹولنے والی پیدا کی گئی جس سے وہ اپنے کھانے کی چیزوں کو اٹھا سکے، ورنہ وہ دانوں کو اٹھانے سے چھل جاتی، اور نہ گوشت کو نوچنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور چونکہ اس کے دانت نہیں ہیں بلکہ کھڑا دانہ نگل جاتا ہے اور کچا گوشت کھا جاتا ہے اس لیے اس کے پیٹ کے اندر بہت زیادہ حرارت پیدا کی گئی جو اس کی غذا کو خوب گلا دے۔ جس کی وجہ سے چبانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

اسے اس طرح سمجھ لو کہ انگور وغیرہ کے بیج تو آدمی کے پیٹ سے سالم نکل آتے ہیں

مگر پرندوں کے پیٹ میں ایسے گل جاتے ہیں کہ ان کا اثر بھی نہیں رہتا۔ (اس سے ثابت ہوا کہ پرندوں کے پیٹ یا پوٹے میں ایسی حرارت ہے جو سخت سے سخت بیج اور دانوں کو بھی گلا دیتی ہے۔)

پھر وہ ایسے بھی بنائے گئے ہیں کہ انڈے ہی دیا کریں، بچے نہ جنیں تا کہ اڑنے میں ان کو گرانی نہ ہو، کیونکہ اگر بچہ اس کے پیٹ میں اتنے دنوں تک ٹھہرتا کہ مضبوط ہو جائے تب پیدا ہوتو اسے بہت گرانی ہوتی، اور اڑنے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ لہٰذا اس کی خلقت اور ساخت کی ہر چیز اسی مناسبت سے پیدا کی گئی ہے جس صورت سے اس کا ہونا مقدر ہو چکا ہے۔

پھر یہ بھی مقدر ہوا کہ یہ فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ (جس کی فطرت اڑنے ہی کے لیے بنائی گئی ہے) اپنے انڈوں پر بیٹھے اور ایک یا دو ہفتے یا تین ہفتے تک اپنے پروں کے نیچے رکھے تا کہ بچہ نکلے۔ پھر وہ کیسا اس پر ہمہ تن متوجہ ہوتا اور اسے ہوا بھراتا ہے تا کہ اس کا پوٹہ غذا کے واسطے وسیع ہو جائے۔ پھر اسے پرورش کرتا ہے اور ایسی چیز سے غذا دیتا ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے۔

کس نے یہ کام اس کے متعلق کیا کہ پہلے دانے چنے پھر جب اس کے پوٹے کے اندر ٹھہرے تو اسے نکالے اور اس سے اپنے بچے کو بھرائے اور کیوں وہ اس مشقت کا متحمل ہوتا ہے، حالانکہ نہ اس کے لیے غور وفکر کی طاقت دی گئی ہے اور نہ اسے وہ امید ہی ہے جو انسان کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً عزت، بخشش اور بقائے نام ونسل وغیرہ۔ یہ ایسا فعل ہے جو گواہی دے رہا ہے کہ کسی خاص ایسے سبب سے خدائے تعالیٰ جل جلالہٗ کی عنایت سے اس کے بچے کے لیے معطوف ہوا ہے (پرورش کا سبب ہوا ہے) جسے وہ پرندہ خود نہیں جان سکتا۔ اور نہ اسے اس کی فکر وغور ہے۔ وہ کیا ہے؟ یعنی وہ دوام وبقائے نسل ہے۔

مرغی کو دیکھو کہ انڈے سینے اور بچے نکالنے کے لیے کیسی بیقرار ہوتی ہے۔ حالانکہ نہ اس کے انڈے یکجا ہوتے ہیں اور نہ اس کا کوئی خاص گھونسلا ہے، بلکہ ابھرتی اور پھولتی اور کڑکڑاتی ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے جب تک کہ اس کے پاس انڈے نہ جمع کر دیے جائیں جنہیں وہ سے سکے اور بچے نکال سکے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اسی لیے نا، تا کہ اس کی نسل باقی رہے (ورنہ اسے اس قدر کوشش کی کیا ضرورت تھی) اور اگر قدرتاً اس میں یہ بات پیدا نہ کی گئی ہوتی تو کون اس کو نسل کی بقا پر مجبور کرتا؟ حالانکہ نہ اس میں ادراک ہے نہ غور وفکر کی قوت (جس سے وہ سمجھتی کہ مجھے انڈے سینے چاہئیں تا کہ ان سے بچے نکلیں اور میری نسل قائم رہے)۔

انڈے کی ساخت اور اس کے اندر کی بستہ زردی اور رقیق سفیدی پر غور کرو، کہ ایک حصہ تو اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس سے بچہ پیدا ہو اور ایک حصہ اس لیے بنایا کہ اس کی غذا بنے جب تک کہ وہ انڈے سے نکل نہ آئے (زردی سے بچہ بنتا ہے اور سفیدی اس میں جذب ہوتی ہے اور وہی اس کی غذا بنتی ہے۔) دیکھو! کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ از بسکہ اس بچے کی خلقت اس محفوظ چھلکے کے اندر قرار پائے جس میں کوئی بیرونی چیز داخل نہیں ہوسکتی تو اس کی غذا اس کے اندر ہی قرار دی گئی جو اس کے نکلنے کے وقت تک کے لیے کافی ہو سکے۔ کسی شخص کو جب ایسے سخت قید خانے میں بند کرتے ہیں جس میں کوئی جانے نہ پائے۔ تو اس کے پاس اس قدر قوت (خوراک) بھی رکھ دی جاتی ہے جو اس کے قید خانے سے نکلنے کے وقت تک کے لیے کافی۔ (اسی طرح انڈے کے اندر بچے کے لیے غذا کا سامان یعنی انڈے کی سفیدی پیدا کی گئی جو اس میں جذب ہو کر اس کی غذا بنے)۔

پرندے کے پوٹے اور اس حکمت پر غور کرو جو اس میں قائم کی گئی ہے۔ چونکہ سنگ دانے میں غذا کے جانے کا راستہ تنگ ہے تھوڑی تھوڑی کر کے غذا اس میں پہنچتی ہے تو اگر ایسا

ہوتا، کہ پرندہ دوسرا دانہ تو چکنے نہ پائے کہ پہلا دانہ سنگدانے میں پہنچ جائے تو اسے بڑی دیر لگتی، اور چونکہ وہ اپنی نہایت ہی دور اندیشی سے جلدی جلدی اپنے کھانے کی چیز کو بھر لیتا ہے تو اس کا پوٹہ ایسا بنایا گیا جیسے توبرہ جو اس کے آگے لٹکا ہوا ہے تاکہ جو کچھ اسے کھانے کے لیے ملے جلدی سے اس میں بھر لے۔ پھر آہستہ آہستہ سنگدانہ (جو خاص ہضم کرنے کے واسطے بنایا گیا ہے) تک پہنچائے۔

پوٹے میں ایک اور بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ بعض پرندوں کو اپنے بچے بھرانے کی ضرورت ہوتی تو ایسی صورت میں غذا کا بچے کے پوٹے کی طرف قریب سے لوٹا دینا آسان ہوتا ہے۔ (برخلاف اس کے اگر اس کے دانے پیٹ میں جا کر جمع ہوا کرتے پھر بچوں کو بھرانے کے واسطے پیٹ کے اندر سے نکال کر بچے کے منہ میں بھرنا بہت دشوار ہوتا۔ لہٰذا ایسا مقرر ہوا کہ یہ پرندے دانوں کو پوٹے میں بھر لیں اور قریب ہی سے اپنے بچوں کو بھرا سکیں۔)

مفضل کہتے ہیں...... میں نے عرض کی کہ معطلہ فرقے میں سے کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ رنگوں اور شکلوں کا پرندوں میں مختلف ہونا محض عناصر واخلاط کے امتزاج اور ان کی مقدار کی کمی بیشی کی وجہ سے ہے۔ کسی نے خاص طور پر ایسا نہیں بنایا ہے۔ (پرندہ مختلف رنگوں کا ہو اور مختلف طرح کی شکلیں ہوں، جیسے مور، چتلے مرغ، تیتر وغیرہ بلکہ ان کے رنگوں کا اختلاف صرف مادے کی کمی بیشی کی وجہ سے ہے۔)

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ گلکاریاں جنہیں تم مور اور دُرّاج (تیتر) وغیرہ میں دیکھتے ہو اور یہ تدریجی برابر اور مقابلہ (کہ اگر ایک طرف دو انگل سرخ ہے تو دوسری طرف بھی ایسا ہی ہوگا۔ ایک بازو میں جو رنگین اور جس صفت کا ہے، دوسرے بازو میں بھی اسی نمبر کا پر اسی رنگ اور صفت کا ہوگا۔ جتنا چڑھاؤ، اتار ایک جانب ہے اتنا ہی دوسری جانب بھی ہے۔) جیسے کوئی شخص قلم سے نقشبندی اور مصوری کرتا ہے۔ اسے یہ امتزاج (باہمی امتزاج

عناصر) مہمل (بے عقل وشعور) ایسی شکل پر جس میں کچھ اختلاف نہ ہو کیوں کر بنا سکتا ہے۔
اگر یہ رنگینیاں اور گلکاریاں بغیر کسی صانع کے ہوتیں تو ان میں نسبت مساوات نہ رہتی، اور اختلاف ہوتا (حالانکہ ہم کس حسن و دلفریبی کے ساتھ ان رنگ آمیزیوں کو پرندوں میں دیکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر حکیم نے نہایت ہی صناعی اور حکمت سے ان میں ایسے ایسے رنگوں کو رنگ آمیز کیا ہے۔)

پرندے کے پر کو غور سے دیکھو کہ کیوں کر بنا ہے؟

تم اسے ایسا دیکھو گے جیسے کپڑا باریک تیلیوں سے بنا جاتا ہے اسی طرح بنے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے، جیسے ایک ڈورا دوسرے ڈورے سے اور ایک بال دوسرے بال سے۔

پھر تم اس بناوٹ کو دیکھو کہ جب تم اسے کھولو تو تھوڑا کھل جاتا ہے، اور پھٹ نہیں جاتا، تاکہ اس میں ہوا بھر سکے اور جب وہ اڑنا چاہے اُڑ سکے۔

اور پر کے بیچ میں تم ایک مضبوط موٹی سِینک (سلائی) دیکھو گے جس پر بالوں کے مانند ایک چیز بُنی گئی ہے تاکہ وہ اپنی سختی کی وجہ سے اسے تھامے رہے اور وہ سینک پر کے اندر ایک سوراخ دار چیز اور کھوکھلی ہے تاکہ پرندے کو بار نہ ہو، اس کو اڑنے سے روک نہ سکے۔

کیا تم نے اس لمبی ٹانگوں والے پرندے کو بھی دیکھا ہے اور یہ بھی سمجھے ہو کہ اس کی ساقیں (پنڈلیاں) لمبی ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ اکثر یہ پرندہ پانی کی کم گہرائی کے مقام پر ہوتا ہے۔ تم اسے دیکھتے ہو گے کہ اپنی لمبی لمبی ساقوں سے گویا ایک مقام پر بیٹھ کر نگہبانی کر رہا ہے اور وہ غور کرتا رہتا ہے کہ اپنی میں کیا چیز چلی۔ پس جب کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جو اس کی غذا کے قابل ہے تو آہستہ آہستہ چند قدم چل کر اسے پکڑ لیتا ہے اور اگر اس کی ساقیں چھوٹی ہوتیں اور پھر شکار کی طرف اس کے پکڑنے کے لیے چلتا تو اس کا پیٹ پانی سے مل جاتا اور پھول جاتا

تو وہ اس سے خوف کھا کر الگ ہو جاتا۔ لہٰذا اس کے لیے یہ دو عمود بنائے گئے کہ اپنی ضرورت پوری کر سکے اور اس کے مطلب میں کچھ خرابی نہ پڑے۔

پرندے کی خلقت میں جو کئی طرح کی حکمتیں صرف کی گئی ہیں ان پر غور کرو۔ تم ہر لمبی ساقوں (پنڈلیوں) والے پرندے کو دیکھو گے کہ اس کی گردن بھی لمبی ہوتی ہے۔ یہ اس غرض سے کہ زمین سے اپنی غذا اٹھا سکے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لمبی گردن کے بدلے لمبی سی چونچ بنا دی جاتی ہے تا کہ اس سے مزید سہولت ہو جائے۔

کیا تم ایسا نہیں دیکھتے کہ مخلوقات میں سے جس چیز کو تلاش کرو اسے نہایت ٹھیک و درست اور حکمت کے ساتھ پاؤ گے (ضرور ایسا ہی ہے۔ مخلوقات میں کوئی ایسی چیز نہیں معلوم ہوتی جس میں انواع و اقسام کی حکمتیں نہ صرف کی گئی ہوں اور جو بالکل اس شے کے مناسب ہی نہ ہوں۔)

پرندوں کی خوراک

ان جڑی بوٹیوں کو دیکھو جنہیں یہ پرندے دن میں تلاش کرتے ہیں۔ نہ تو ایسا ہوتا ہے کہ انہیں مل ہی سکیں اور نہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی جگہ رکھی ہوئی دستیاب ہو جائیں، بلکہ تلاش کرنے اور چلنے پھرنے سے دستیاب ہوتی ہیں۔ یہی حالت دوسری مخلوقات کی بھی ہے۔

سبحان اللہ۔ وہی قابل تسبیح و تقدیس ہے جس نے روزی معین کی۔ کس کس طرح سے ان کو قوت (روزی) پہنچائی اور ایسا نہ کیا کہ یہ اس پر قادر بھی نہ ہو سکے۔ کیونکہ خلقت کو اس کی احتیاط ہے اور نہ ایسا بنایا کہ عام طور پر ہر جگہ آسانی سے مل جائے۔ کیونکہ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے اس لیے کہ اگر غذا اکٹھی ایک ہی جگہ مل جایا کرتی تو بہائم اسی میں لوٹا کرتے اور وہاں سے جدا ہی نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ بدہضمی پیدا ہو جاتی اور پھر مر جاتے اور انسان بھی فراغت و اطمینان کی وجہ سے نہایت کبر و نخوت میں پڑ جاتے تو بہت سے فسادات پیدا

ہوتے اور فواحش میں اضافہ ہونے لگتا۔ اس لیے ایسا بنایا گیا کہ اشیائے غذا ہر قسم کے جانداروں کی متفرق مقامات سے حاصل ہوں تاکہ ان کی تلاش میں ان جانداروں کی ورزش بھی ہوتی رہے حرکت کی وجہ سے ان کی غذا بھی ہضم ہو جائے۔ فکر و خیال کی وجہ سے ان کو نخوت کا بھی موقع نہ ملے۔

تم کچھ جانتے ہو کہ وہ پرندے جو صرف رات ہی کو نکلا کرتے ہیں جیسے اُلو، کیڑے مکوڑے اور چمگادڑ وغیرہ، ان کی خوراک کیا ہے؟

مفضل کہتے ہیں میں نے عرض کیا ''مولا! مجھے معلوم نہیں۔''

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا...... ان حیوانات کی خوراک وہ انواع و اقسام کے کیڑے ہیں جو اس فضا میں پھیلے ہوئے ہیں مثلاً مچھر، پروانے اور ٹڈیوں کی صورت کے پتنگے اور مکڑیاں وغیرہ۔ یہ تمام جانور فضائے آسمان میں پھیلے رہتے ہیں۔ کوئی مقام ان سے خالی نہیں رہتا۔

اسے اس طرح سمجھ لو کہ جب تم رات کو کسی چھت پر یا صحن خانہ میں چراغ روشن کرتے ہو تو اس قسم کے بہت سے کیڑے اس پر جمع ہو جاتے ہیں یہ سب کہاں سے آتے ہیں۔ قریب ہی سے تو آتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جنگلوں اور میدانوں سے آتے ہیں تو اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اسی وقت اتنی دور سے کیوں کر آ پہنچتے ہیں اور اتنے فاصلے سے چراغ کو کیسے دیکھتے ہیں جو کسی ایسے مکان میں روشن کیا گیا ہے جس کے اطراف اور بہت سے مکانات ہیں۔ بایں ہمہ یہ تو ایک چشم دید بات ہے کہ یہ کیڑے قریب ہی سے چراغ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب فضائے آسمانی کے ہر مقام میں پھیلے ہوئے ہیں اور شب کے نکلنے والے پرندے جب نکلتے ہیں تو انہیں پکڑ پکڑ کے اپنی غذا بناتے ہیں۔

دیکھو ان پرندوں کے لیے اس قسم کے فضا میں پھیلے ہوئے کیڑے مکوڑوں سے

کیوں کر روزی پہنچانے کا راستہ نکالا گیا ہے۔

بعض حیوانات کی خِلقت کی حکمتیں

اسی کے ساتھ ساتھ ان حیوانات کے پیدا ہونے کی غرض بھی سمجھو! شاید کوئی خیال کرنے والا یہ خیال کرے کہ یہ فضول پیدا ہوئے ہیں ان سے کوئی فائدہ ہی نہیں۔

چمگادڑ (خفاش) کو تو ایک عجیب الخلقت جانور پیدا کیا ہے جو پرندے اور چوپائے کے بَین بَین ہے، بلکہ چوپاؤں سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے کہ اس کے دو کان اوپر کو نکلے ہوئے ہیں۔ دانت ہیں، باریک رونگٹے ہیں، بچے جنتا ہے، دودھ پلاتا ہے۔ بول و براز کرتا ہے۔ جب چلنا چاہتا ہے چاروں پیروں سے چلتا ہے۔ یہ سب صفتیں پرندے کے برخلاف ہیں۔ پھر یہ شب ہی کو نکلتا ہے اور ان کیڑوں اور پتنگوں کو اپنی غذا بناتا ہے جو فضائے آسمانی میں منتشر ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ چمگادڑ تو کچھ کھاتی ہی نہیں۔ اس کی غذا صرف ٹھنڈی ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات دو وجوہات سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پیشاب، پائخانہ نکلتا ہے۔ یہ بات بغیر غذا کے ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسرے یہ کہ اس کے دانت ہیں۔ اگر یہ کچھ نہ کھاتا ہوتا، تو دانت اس کے بالکل بیکار تھے۔ حالانکہ خلقت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔

اس جانور (چمگادڑ) کے وجود کے فائدے تو مشہور ہی ہیں۔ اس کی بیٹ بعض عملی چیزوں میں داخل کی جاتی ہے اور بڑی غرض تو اس کی وہ عجیب وغریب ساخت اور خلقت اور اپنی مصلحت اور فائدے کے لیے اس کا آنا جانا۔ جہاں چاہے اور جس طرح چاہے۔ جو خالق جل شانہٗ کی قدرت کو بتا رہی ہے۔

اور وہ پرندہ جسے ابن تمرہ (غالبًا اس سے مراد وہ پرندہ ہے جسے ہندوستان میں پیا کہتے ہیں)۔ کبھی کبھی درختوں پر آشیانہ بناتا ہے۔ جب کسی بڑے سانپ کو دیکھتا ہے کہ اس

کے گھونسلے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس کو نگل جانے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ تو نہایت تیچین ہوتا ہے اور کوئی تدبیر بچنے کی کرتا ہے تو وہ جلدی سے اڑ کر حسکہ (خار خشک جسے گوکھرو کہتے ہیں) اٹھا لاتا ہے اور سانپ کے منہ میں اوپر سے ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے سانپ لوٹنے لگتا ہے اور بالآخر اس کی تکلیف سے مر جاتا ہے۔

اگر میں تم سے یہ بات نہ بیان کرتا تو کیا تمہارے یا کسی اور کے دل میں اس کا خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ حسکہ (پیا) میں یہ بڑی منفعت ہے یا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ کسی چھوٹے یا بڑے پرندے کو یہ تدبیر سوجھ سکتی ہے۔

اس سے عبرت حاصل کرو۔ اور اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں جن میں غیر معلوم فوائد ہیں جو بغیر کسی نئے واقعے کے جو بیان کیا جائے یا کسی خبر کو جو سُنی جائے معلوم نہیں ہو سکتے۔

شہد کی مکھی کو دیکھو اور غور سے شہد کے بنانے پر ان کی اجتماعی کوشش سے جمع ہونے اور چھ پہلوؤں کا گھر بنانے پر تفکر کرو، اور یہ کہ اس میں فطانت (ذہانت) کی کیا کیا باریکیاں ہیں؟ جب تم اس کے کام پر غور کرو گے تو تمہیں نہایت ہی عجیب ولطیف معلوم ہو گا۔ اور جب ان کی بنائی ہوئی چیز کو دیکھو گے تو بہت ہی قابل عظمت پاؤ گے۔ جو آدمیوں کے لیے کیسی اچھی ذائقہ دار صحت بخش مصرف کی چیز ہے۔

اور جب اس کام کے کرنے والے کہ جس نے ایسا باقاعدہ مکان بنایا اور جس نے پھولوں کے عرق سے شہد تیار کیا اور موم بنایا۔ یعنی شہد کی مکھی کو دیکھو گے تو اسے نہایت ہی غبی (ناسمجھ) پاؤ گے جو اپنے تئیں بھی نہیں سمجھ سکتی، چہ جائیکہ اور چیزیں۔

پس اس میں صاف اور کھلی ہوئی دلیل اس بات کی موجود ہے کہ اس کی صنعت کی یہ درستی اور حکمت اس مکھی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کی حکمت ہے جس نے انہیں اس فطرت

پر پیدا کیا ہے اور آدمیوں کی مصلحت کے لیے اس کام پر اسے مجبور کر دیا ہے (تاکہ وہ شہد بنایا کرے جس سے انسان فائدہ اٹھائے اسے اپنے علاج میں صرف کر سکے۔ اس کے ذائقہ سے محظوظ ہو سکے۔)

اس ٹڈی کی خلقت اور ساخت دیکھو گے تو کمزور پاؤ گے لیکن قوی بھی ہے۔ اور اگر اس کا لشکر کسی مقام پر آ پڑے تو اسے نہایت قوی و طاقتور پاؤ گے۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ روئے زمین کے بادشاہوں میں سے اگر کوئی بادشاہ اپنے لشکر کو ٹڈیوں کے لشکر سے بچانے کے لیے جمع کرے تو وہ اس پر قادر نہ ہو گا۔

کیا یہ بات خالق کی قدرت پر دلیل نہیں ہے کہ وہ اپنی کمزور ترین مخلوقات کو قوی ترین مخلوقات پر بھیج دے اور وہ اس کے دفعیہ پر قادر نہ ہو۔ اسے دیکھو! کہ روئے زمین پر کیسے سیلاب کی طرح آ پڑتی ہے اور کوہ و صحرا، میدان و شہر سب کو گھیر لیتی ہے یہاں تک کہ اس کی کثرت سے آفتاب کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

بتاؤ کہ اگر یہ ٹڈیاں ہاتھ سے بنائی جاتیں تو کب اس کثرت سے جمع ہو سکتی تھیں اور کتنے برس اس کے لیے درکار ہوتے اور ایسی بن بھی نہ سکتی تھیں۔ اس سے پروردگار نے اپنی قدرت کا ثبوت دیا ہے جس قدرت کو کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی اور نہ اسے کوئی چیز زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

مچھلی کی خلقت اور ان مناسبتوں کو دیکھو کہ جس حالت پر اس کا ہونا اور رہنا مقدر ہو چکا ہے، کس طرح اس میں موجود ہیں۔

(۱) اُسے ٹانگیں نہیں دی گئیں، کیونکہ اس کو چلنے کی ضرورت نہ تھی اس کا مسکن پانی قرار دیا گیا۔ (۲) اس کے پھیپھڑے نہیں پیدا کیے گئے کیونکہ اسے سانس لینا ممکن نہیں۔ (اگر سانس لیتی تو پیٹ میں اس کے پانی بھر جایا کرتا اور مر جاتی۔) جبکہ وہ سمندر میں

ڈوبی ہوئی ہے۔ (۳) اسے ٹانگوں کے بدلے سخت ترین پر دیے گئے جن سے وہ دونوں طرف پانی کو کاٹتی جاتی ہے۔ جیسے ملاح چپوؤں سے کشتی کے دونوں طرف پانی کاٹتا ہے۔ (۴) اس کے جسم کو موٹے چھلکوں کا لباس پہنایا گیا جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہیں جیسے زرہ یا جوشن کی کڑیاں، تاکہ اپنے تئیں آفتوں سے بچا سکے۔ ۵ اسے قوت شامہ بہت ہی زیادہ دی گئی۔ اس لیے کہ نظر اس کی کمزور ہے اور پانی اسے روکتا ہے تو کھانے کی چیز کو دور سے سونگھ لیتی ہے اور پھر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے ورنہ کیوں کر اسے محسوس کر سکتی (کہ کھانے کی چیز کیا ہے اور کہاں ہے؟) ۶ اور (یہ بھی) جان لو، کہ اس کے دہانے سے لے کر دونوں کانوں تک سوراخ بنائے گئے ہیں۔ منہ سے تو پانی پیتی اور اس راہ سے نکال دیتی ہے اور اس طرح روح کی ترویح و آسائش کرتی ہے جیسے دیگر حیوانات ٹھنڈی ہوائے صبح سے ترویح روح حاصل کرتے ہیں۔

اب اس کی نسل کی زیادتی کو اور اس کی خصوصیت کو سمجھو اور غور کرو۔ تم ایک مچھلی کے پیٹ میں اتنے انڈے پاؤ گے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دیگر جانوروں کی غذا میں اس کی وجہ سے زیادتی ہو جائے کیونکہ اکثر حیوانات مچھلیوں ہی کو کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ درندے بھی جھاڑیوں کے اندر پانی کے کنارے مچھلیوں کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں جیسے ہی کوئی مچھلی ان کے قریب سے گزرتی ہے تو یہ فوراً اُچک لیتے ہیں۔

پس چونکہ درندے بھی مچھلیاں کھاتے ہیں اور پرندے بھی مچھلیاں کھاتے ہیں اور آدمی بھی اس کو اپنی غذا بناتا ہے، خود مچھلیاں بھی مچھلیوں کو کھاتی ہیں۔ (بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں) تو اس میں حکمت یہی ہے کہ جس کثرت سے اب ہیں اسی قدر آئندہ ہوں۔

پھر اگر تم کو خالق عالم کی وسعت، حکمت اور مخلوقین کے کمی علم کو جاننا مقصود ہو تو

سمندر کے ان انواع واقسام کی مچھلیوں، آبی حیوانات، سیپ اور دوسرے جانوروں کو دیکھو جن کا شمار نہیں ہوسکتا ہے اور نہ جن کے فائدے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر یکے بعد دیگرے جنہیں انسان ان ذریعوں سے معلوم کرتا ہے جو پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً قُرمُز ہے کہ اس کے رنگ کو لوگوں نے یوں جانا کہ ایک مادہ کتیا دریا کے کنارے دوڑ رہی تھی اسے ایک چیز ملی جسے حلزون (یہ ایک کیڑا ہے جو اونٹوں کی چراگاہ میں ہوتا ہے اور رنگ دیتا ہے) کہتے ہیں، تو اس کو کھا لیا۔ اس سے اس کا دہانہ رنگین ہو گیا۔ لوگوں کو جو یہ اچھا سا رنگ معلوم ہوا تو قرمز (جھاؤ کا کیڑا ہے جس سے ریشم کو رنگتے ہیں) کو رنگ بنا لیا اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں، جسے لوگ وقتاً فوقتاً معلوم کرتے ہیں۔ (اور بہت سی ایسی ہی چیزیں ہیں، جو اب تک معلوم ہی نہیں ہوئی ہیں)۔

مفضل کہتے ہیں ..... اتنے میں زوال کا وقت قریب آ گیا اور مولیٰ، نماز کے لیے اٹھے اور فرمایا: ''کل سویرے صبح کو انشاء اللہ تعالیٰ آنا۔

میں وہاں سے واپس آیا، اور ان علوم کی وجہ سے جو حضرت نے مجھے تعلیم فرمائے تھے بے انتہا خوش تھا، آپؑ کے اس عطیہ پر نہایت مسرور اور خدا کے اس انعام پر شکر کرتا تھا، اور وہ شب بہت ہی خوشی میں بسر کی۔

تیسری نشست

جب تیسرا دن ہوا، تو صبح سویرے ہی میں اپنے مولیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے لیے اجازت مانگی گئی، میں داخل بیت الشرف ہوا۔ آپ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا میں بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا:

الحمد لله الّذی اصفانا ولم یصطف علینا اصفانا بعلمه
و ایّدنا بحلمه من شذّعنّا فالنّار ماواه و من تفیّأ بظل
دوحتنا فالجنّة مثواه

اے مفضل! میں نے تمہارے سامنے انسان کی خلقت اور جس خدا نے اس کی اصلاح و تدبیر فرمائی ہے اور اس کے حالات کا متغیر ہونا اور جو اس میں عبرت ہے مفصّل بیان کر دی اور حیوانات کے حالات کی بھی تشریح کر دی اب میں سما (بظاہر اس سے بلندیٔ آسمان اور اس کی فضا مراد ہے)۔ آفتاب، چاند، ستارے، افلاک (حرکت کرنے والے آسمان) رات، دن، گرمی، سردی، ہوائیں، عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) بارش، بڑے بڑے پتھر، پہاڑ، چھوٹے پتھر، کیچڑ، معدنیات، نباتات، درخت خرما اور عام درختوں کا ذکر کرتا ہوں، اور یہ کہ ان میں کیا کیا دلیلیں اور عبرتیں ہیں۔

آسمان کے بارے میں

سماء (بلندی و فضائے آسمان) کے رنگ کو دیکھو! کہ اس میں کیا بہترین تدبیر ہے؟ کیونکہ یہ رنگ نظر کے لیے تمام رنگوں کی بہ نسبت زیادہ مناسب اور مقوی ہے۔ یہاں تک کہ اطباء بھی اس شخص کے لیے جس کی آنکھ میں کوئی بیماری ہو گئی ہو سبزی کی طرف برابر دیکھنا، یا جو اس سے قریب قریب مائل بہ سیاہی ہو تجویز کرتے ہیں اور حاذق حکیم اس کے

لیے جس کی نظر کمزور ہو گئی ہو۔ ایسے لگن میں دیکھا کرنا بتاتے ہیں جس کا رنگ سبز ہو اور اس میں پانی بھرا ہوا ہو۔

تو دیکھو! کہ اللہ جل و تعالیٰ نے آسمان[1] سبز رنگ کا کیوں کر بنایا ہے جو مائل بہ سیاہی ہے۔ تاکہ ان نگاہوں کو روکے جو اس پر بار بار پڑتی ہیں اور دیر تک دیکھنے سے ان میں خرابی (یا کوئی خراش) نہ ڈالے پس یہی ایک چیز ہے جس کو لوگوں نے فکر و غور اور تجربوں سے حاصل کیا ہے۔ (یعنی یہ کہ آشوب چشم والے کو سبز رنگ کی طرف دیکھنا چاہیے) وہ خدائی حکمت بالغہ کے ذریعے سے اس کی خلقت میں منزوع عنہ (یعنی مخالف خلقت مخلوق نہیں) پائی جاتی ہے۔ جن میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی، بلکہ پہلے ہی سے انسان وغیرہ کی ضرورت کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ تاکہ عبرت حاصل کرنے والے اس سے عبرت حاصل کریں اور ملحدین اس میں غور کریں۔ اللہ ان کو قتل کرے۔ یہ کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں۔ (قاتلهم الله انی یوفکون)

مفضل! رات اور دن کے قائم کرنے کے لیے آفتاب کے طلوع اور غروب کرنے کی بابت غور کرو۔

پس اگر اس کا طلوع نہ ہوتا تو تمام عالم کا کام بھی تباہ و برباد ہو جاتا۔ نہ تو لوگ اپنے معاش کی کوشش کر سکتے تھے اور نہ اپنے دوسرے کام کر سکتے تھے، جبکہ تمام دنیا ان کی نگاہ میں تیرہ و تاریک ہوتی اور روشنی کی لذت اور راحت نہ پانے کی وجہ سے ان کی زندگی بھی بامزہ و خوشگوار نہ ہوتی۔

اس کے طلوع کے اغراض تو خیر اس قدر واضح ہیں کہ اس کے بیان میں طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے غروب کے فوائد پر غور کرو۔

---

[1] حدیث میں لفظ سما ہے جس سے میں فضائے آسمان اور اس کی بلندی سمجھتا ہوں کیونکہ مقابلہ میں اس کے معصوم نے فلک فرمایا ہے جس سے خاص گردش کرنے والا آسمان مراد ہے۔

پس اگر وہ غروب نہ ہوتا، تو آدمیوں کو آرام وقرار ہی نہ ملتا، باوجود اس کے ان کو اپنے بدن کو راحت پہنچانے اور اپنے حواس کو مجتمع کرنے اور ہضم طعام کے لیے قوت ہاضمہ کو ابھارنے اور غذا کو اعضاء کے اندر اثر ونفوذ کرانے کے لیے بڑی سخت ضرورت سکون و آرام لینے کی ہے۔

پھر (اگر غروب آفتاب نہ ہوتا اور رات نہ آتی برابر دن ہی رہتا تو) ان کا حرص ان سے برابر اس قدر کام لیتا کہ جس سے ان کے جسم میں سخت خرابی پیدا ہوتی۔ کیونکہ اکثر آدمی اس قسم کے ہیں کہ اگر یہ رات ان پر اپنی تاریکی نہ ڈالے تو کسب معاش اور جمع مال اور خزانہ کرنے کی حرص کی وجہ سے بالکل آرام وقرار ہی نہ لیں۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ برابر آفتاب کے روشن رہنے کی وجہ سے تمام زمین تپتی رہتی اور جو حیوانات یا نباتات کہ اس پر ہیں وہ بھی ہر وقت جلتے رہتے (اور اس سبب سے تمام حیوانات و نباتات کو سخت نقصان پہنچتا) لہٰذا اس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت وتدبیر سے یہ مقدر کر دیا کہ ایک وقت غروب کرے اور ایک وقت طلوع کرے۔ جیسے، چراغ مکان والوں کے لیے ایک وقت میں ضرورتوں کے رفع کرنے کے لیے روشن کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح پھر ان سے غائب ہو جاتا یعنی بجھا دیا جاتا ہے) تاکہ انہیں سکون وقرار ملے۔ تو باوجودیکہ نور اور ظلمت دونوں آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، پھر بھی ان امور کے لیے جن میں اصلاح و درستی عالم ہے کس قدر مطیع ومعین ہیں۔ (اس میں مانویہ فرقہ کی رد ہے، جو کہتا ہے کہ تاریکی محض شر ہے اس میں کوئی خیر وخوبی نہیں۔ حالانکہ ظلمت یعنی تاریکی میں اتنے فوائد ہیں جو اوپر بیان فرمائے گئے ہیں)۔

پھر سال کے چاروں زمانوں (گرمی، سردی، بہار، خزاں) کے قائم کرنے کے لیے آفتاب کے بلند ہونے اور نیچے کی طرف جھکنے پر غور کرو کہ اس میں کیا تدبیر ومصلحت ہے؟

(آفتاب کے بلند ہونے سے مطلب اس کا خط استواء سے جانب شمال آنا اور انحطاط سے مطلب جانب جنوب چلا جانا ہے جو نظام بطلیموسی سے اور نیز ارصادات کواکب سے ثابت ہے کہ آفتاب کی براہ مدارات یومیہ جانب جنوب وشمال حرکت ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے اعتدال ربیعی، اعتدال خریفی، انقلاب صیفی، انقلاب شتوی پیدا ہوتے ہیں (یعنی بہار، خزاں، سردی و گرمی پیدا ہوتی ہیں)۔

جس زمانے میں اس کا رجحان جانب شمال ہوتا ہے تو شمالی ملکوں میں گرمی ہوتی ہے اور جب جانب جنوب چلاتا ہے تو شمالی حصوں میں سردی ہوتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس، اس کے برعکس جنوبی ملکوں میں ہے۔ انہیں دو زمانوں کے درمیانی رفتار آفتاب میں فصل ربیع و فصل خریف ہوتی ہے۔)

جاڑے میں درخت اور دیگر نباتات میں حرارت عود کر آتی ہے اور ان میں پھلوں کے مادے پیدا ہوتے ہیں (اس وجہ سے کہ سردی کی وجہ سے مسامات ہر شے کے بند ہو جاتے ہیں اور حرارت اس کے اندر ہی جمع رہتی ہے۔ یہی وہ اصل حرارت اس کی ہوتی ہے جو پھلوں کے مادوں کو تیار کرتی ہے۔ اگر سردی سے حرارت کا جمع ہونا مثال سے سمجھنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ اس زمانے میں کنوؤں کا پانی گرم ہوتا ہے اس لیے کہ زمین کی حرارت باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کے مسامات بند ہو جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے گرمیوں میں کنوؤں کا پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے اس لیے کہ حرارت بہ سبب مسامات کے کھلے رہنے کے نکلتی رہتی ہے۔

اور ہوا میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ابر اور بارش پیدا ہوتے ہیں، اسی فصل میں حیوانات کے بدن قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔

فصل ربیع میں بھی حرارت (طبیعی) حرکت میں آتی ہے اور اس مادے کا ظہور ہوتا

ہے جو سردی کے موسم میں پیدا ہوا ہے۔ اس سے نباتات میں خوشے لگتے ہیں۔ درختوں میں پھل آتے ہیں۔ حیوانات کو ہیجان شہوت ہوتا ہے۔

گرمی میں ہوا گرم ہو جاتی ہے جس سے پھل پختہ ہوتے ہیں اور جسم کی رطوبات فعلیہ تحلیل ہوتی ہیں۔ زمین خشک ہو کر عمارت بنانے اور نیز دوسرے کاموں کے قابل ہو جاتی ہے۔

لہٰذا، خریف کے زمانے میں ہوا صاف ہو جاتی ہے۔ امراض دفع ہو جاتے ہیں۔ بدن صحیح ہو جاتے اور رات طولانی ہو جاتی ہے۔ اس میں بعض بعض کام (اطمینان کے ساتھ) اس کے طولانی ہونے کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔

اس فصل میں اور مصلحتوں کے لیے بھی ہوا بہت اچھی ہوتی ہے۔ اگر میں ان سب کا ذکر کروں تو طول کلام ہو جائے گا۔

اب سال کا دور قائم کرنے کے لیے آفتاب کے بارہ برجوں میں منتقل ہوتے رہنے پر غور کرو۔ اور دیکھو کہ اس میں کیا حکمت ہے؟

یہ وہی دور ہے جس سے سال کے چاروں زمانے، جاڑا، ربیع، گرمی اور خریف بنتے ہیں اور یہی دوران چاروں زمانوں کو پورا کرتا ہے۔ آفتاب کے اس قدر دورے اور گردش میں غلے اور پھل تیار ہوتے ہیں اور انسان کی غرض و غایت تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر دوبارہ عود کرتے اور نشو و نما شروع کرتے ہیں۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ برج حمل سے برج حمل تک آفتاب کے چلنے کی مقدار کا نام سال ہے۔ پس سال اور ایسی ہی چیزوں (مہینوں اور ہفتوں وغیرہ) سے زمانے کا شمار و پیمانہ اس وقت سے ہے جب سے خدائے تعالیٰ نے عالم کو پیدا کیا ہے۔ گزشتہ ہر زمانے اور ہر عصر میں بھی یہی ہوتا رہا ہے اس سے لوگ عمروں اور قرض و اجارہ اور دیگر معاملات وغیرہ

کاموں کی معین مدتوں کا حساب لگاتے ہیں۔ دورِ آفتاب ہی کی رفتار سے سال پورا ہوتا اور زمانے کا حساب صحت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

دیکھو کہ آفتاب کس طرح عالم پر اپنی روشنی ڈالتا ہے اور کس حکمت سے ایسا ہونا اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس اگر آسمان کے صرف ایک مقام پر آفتاب روشن رہتا، وہیں ٹھہرا رہتا، وہاں سے حرکت نہ کرتا، تو اس کی شعاعوں اور اس کا فائدہ اکثر سمتوں میں نہ پہنچتا، اس لیے کہ پہاڑ اور دیواریں اس سے مانع ہوتیں۔ لہٰذا ایسا بنایا گیا کہ دن کے پہلے حصے میں مشرق سے طلوع کرے اور اپنے سامنے والی مغرب کی تمام چیزوں پر روشنی ڈالے۔ پھر برابر گردش کرتا رہے اور ایک سمت کے بعد دوسری سمت پر پھیلتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مغرب میں پہنچ جائے تو ان تمام چیزوں پر روشنی ڈالے جن پر اس کی تابش دن کے اول حصے میں نہیں پہنچی ہے، تاکہ کوئی ایسا مقام باقی نہ رہ جائے جو فائدے کا ایک حصہ اور وہ غرض نہ حاصل کرے۔ جس کے لیے ایسا کیا گیا ہے (یعنی اس قسم کی گردش آفتاب بنائی گئی ہے) اور اگر ایک سال تک یا سال کے کچھ ہی حصے میں اس کے برخلاف ہو جائے تو بتاؤ بھلا آدمیوں کا کیا حال ہو۔ بلکہ اس صورت میں وہ زندہ ہی کیوں کر رہیں۔ کیا انسان ایسی بڑی بڑی باتوں کو دیکھتا نہیں جن میں اس کی کوئی تدبیر نہ چل سکتی تھی وہ خود اپنے قانون وقواعد پر جاری ہو گئے نہ سستی کرتے ہیں اور نہ اپنی اوقات معینہ سے جو نظام و بقائے عالم کے لیے ضروری ہے پیچھے رہ جاتے بلکہ جس طرح کی ضرورت نظام عالم کے قائم رکھنے کے لیے پڑتی ہے اس کو وہ باقاعدہ جاری کی ہوئی چیزیں انجام دیتی رہتی جیسے یہی حرکت آفتاب ہے کہ اس سے کس طرح باقاعدہ نظام عالم قائم ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خود بخود یہ انتظام ہو گیا ہو۔ کیا آفتاب کے مادے یا صورت میں یہ ادراک ہے جو ایسا کرے؟ کیا آفتاب کو زمین کی چیزوں سے کوئی رشتہ ہے جو اسے نباتات وحیوانات کے فائدہ رسانی کے لیے آمادہ کرتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ کسی

اور مدبر نے جس نے زمین کی چیزوں کو پیدا کیا اور جن کی مصلحت آفتاب کی حرکت اور اس کی روشنی کے اثر پر قرار دی ہے اسی نے اس آفتاب کو بھی پیدا کیا اور اس کو باقاعدہ گردش کرنے والا بنایا تا کہ نظام اشیائے نباتی وحیوانی و جمادی قائم رہے۔

''فتبارك الله احسن الخالقين''

چاند کے بارے میں

اللہ تعالیٰ نے چاند کے ذریعے سے (بڑا) ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں ایک بڑی رہنمائی ہے۔ عام خلائق اس کو مہینے کے شمار میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے مطابق سال کا حساب درست نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا دورہ نہ تو چاروں فصلوں کو پورا کرتا ہے نہ پھلوں کے پیدا ہونے اور ان کی پختگی کو (پورا کرتا) ہے اسی وجہ سے قمری مہینے اور سال شمسی مہینوں اور سال سے مختلف ہوتے ہیں۔ چونکہ قمری مہینے بدلتے رہتے ہیں، تو کبھی وہی ایک مہینہ گرمی میں واقع ہوتا ہے اور کبھی سردی میں (مثلاً کبھی، رجب کا مہینہ جو قمری حساب سے ہے، جنوری میں واقع ہوتا ہے جو شمسی مہینہ ہے اور کبھی مارچ میں علیٰ ہذا القیاس اور مہینوں کا حال ہے۔ یا مثلاً محرم ہی ہے کہ کبھی گرمیوں میں واقع ہوتا ہے، کبھی برسات میں کبھی جاڑوں میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمری اور شمسی مہینے بدلتے رہتے ہیں ایک دوسرے کے مطابق اور حساب میں برابر نہیں ہیں)

اسی بات پر غور کرو کہ یہ (چاند) شب کے وقت کیوں روشن ہوتا ہے اور اس میں حکمت کیا ہے؟

جانداروں کے سکون و قرار اور نباتات کو برودت پہنچانے کے لیے تاریکی کی ضرورت ہے پھر بھی اس میں (کوئی) خوبی نہ تھی کہ رات بالکل ہی گھپ اندھیری ہو، روشنی بالکل نہ ہو کہ کوئی کام بھی اس میں ممکن نہ ہو، اس لیے کہ اکثر رات کے وقت بھی آدمیوں کو کام

کرنے کی اس وجہ سے ضرورت ہوتی ہے کہ بعض کاموں کے لیے دن کا وقت تنگ ہوتا ہے یا گرمی کی شدت وافراط کے سبب سے (دن کو آدمی کام نہیں کرسکتا)۔ تو وہ چاند کی روشنی میں بھی کام کرتا ہے۔ جیسے زراعت، دودھ دوہنا، لکڑی کاٹنا وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا چاند کی روشنی اس لیے بنائی گئی ہے کہ آدمیوں کے کسب معاش میں معین و مددگار ہو۔ جب کبھی اس کی ضرورت پڑے اور راہ گیروں کو چلنے میں دلچسپی رہے اور اس کا طلوع رات کے کسی حصے میں قرار دیا گیا (نہ برابر تمام رات میں) اور آفتاب کی روشنی سے اس کی روشنی کم رکھی گئی۔ اس لیے کہ لوگ اسی طرح کام نہ کرنے لگیں۔ جیسے دن میں کام کرتے ہیں اور آرام ہی نہ لیں۔ تو پھر بیمار ہو کر مر جائیں (یعنی اگر چاند کی روشنی بھی تمام رات قائم رہا کرتی اور اس کی تیزی بھی آفتاب کے مثل ہوتی تو حریص آدمی شب کے وقت آرام نہ کرتے بلکہ اسی طرح کام کاج میں مصروف رہتے جیسے دن کو مصروف کار رہتے ہیں)۔

پس چونکہ ایسا ہونا نظام عالم کے لیے مفید نہ تھا، اس لیے اس کی روشنی مدھم بنائی گئی اور ایسا مقرر ہوا کہ تمام رات نہ روشن رہا کرے، تاکہ انتظام عالم میں خلل نہ پڑے۔

چاند کے تغیرات میں جو رویت ہلال کے وقت، نیز گھٹنے بڑھنے اور گہن لگنے سے ہوتے ہیں خاص کر اس امر کی تنبیہ ہے کہ کسی باقدرت خالق نے یہ تغیرات اس میں صلاح عالم کے واسطے مقرر کیے ہیں جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرسکتے ہیں۔ (یعنی غور کرنے والے ان تغیرات سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آخر چاند میں کمی زیادتی، گہن وغیرہ کیوں رونما ہوتے ہیں۔ اس میں بھی کسی خاص مدبر کی حکمت ہے جس نے نظام عالم کے واسطے ایسا کیا ہے۔)

ستاروں کے بارے میں

مفضل! (ذرا) ستاروں اور ان کے اختلاف رفتار پر غور کرو۔ بعضے تو ایسے ہیں جو

اپنے مرکز و مقام سے جو آسمان میں ان کے لیے مقرر ہے جدا ہوتے ہی نہیں۔ اور اگر ان کو گردش ہوتی ہے تو ایک ساتھ ہی ہوتی ہے (جیسے ثوابت ستارے جو اپنے اپنے مرکزوں پر قائم ہیں) اور گردش فلکی کی وجہ سے اجتماعی طور پر وہ گردش کرتے معلوم ہوتے ہیں مگر خود وہ اپنے مرکز اصلی کو نہیں چھوڑتے) اور بعض اس سے چھوٹے ہوتے ہیں (یعنی وہ متحرک ہوتے ہیں)۔ کہ برجوں میں آتے جاتے رہتے اور رفتار میں بھی مختلف ہیں۔ (مثلاً کسی کا دورہ بارہ مہینے کا ہے، کسی کا صرف ایک مہینے کا کسی کا اٹھارہ مہینے کا، اور علیٰ ہذا القیاس) اور ان میں سے ہر ایک کے لیے دو مختلف رفتاریں ہیں۔ ایک تو عام ہے جو فلک الافلاک کی گردش کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف ہوتی ہے۔ (جو روزانہ کے طلوع و غروب سے معلوم ہو سکتی ہے)۔ دوسرے خود اس کی ذاتی رفتار ہے جو مشرق کی طرف ہوتی ہے۔ جیسے وہ چیونٹی جو چکی کے پاٹ پر پھرتی ہو، چکی تو دائیں جانب سے گردش کرتی ہے اور چیونٹی بائیں جانب سے۔ اس صورت میں چیونٹی کو دو قسم کی مختلف حرکتیں ہوں گی، ایک اس کی ذاتی رفتار ہے جو اپنے سامنے کی طرف ہوگی دوسری بلا ارادہ چکی کے ساتھ ساتھ جو اسے پیچھے کی طرف کھینچتی ہوگی۔ (یہ مسئلہ علم ہیئت کے مسائل میں سے نہایت ہی لطیف ہے اور مثال بھی بے نظیر ہے فلسفہ ہیئت نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ سیارات اپنی اصلی حرکت سے مشرق کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ یہ بات چاند کی حرکت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے کہ پہلی شب میں کہاں طلوع کرتا ہے اور دوسری شب میں اس سے کس قدر مشرق کی طرف، پھر تیسری شب میں دوسری شب سے زیادہ مشرق کی طرف، یہاں تک کہ بارہ تیرہ تاریخ کو ٹھیک مشرق سے طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

یہی حال آفتاب کا بھی ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے سیارات، زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل کی بھی ذاتی حرکت یہی ہے مگر چونکہ فلک الافلاک کی گردش مشرق سے مغرب کی طرف ہے جیسا کہ صرف بارہ گھنٹوں کے ایک دن

میں۔ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ آفتاب کہاں سے نکلا اور کہاں چلا گیا۔ تو یہ تمام سیارات اپنی اصلی حرکت کے ساتھ ساتھ فلک الافلاک کی گردش کے بھی تابع ہیں۔ خود تو آہستہ آہستہ اپنی ذاتی حرکت سے مغرب کی طرف سے مشرق کو آتے ہی ہیں، مگر قسری (غیر ذاتی) حرکت سے مشرق کی طرف سے مغرب کو چلے جاتے ہیں، لہٰذا چیونٹی کی مثال بالکل ٹھیک ہوگئی، جو چکی کی حرکت کے برخلاف چل رہی ہو۔ وہ اپنی حرکت سے ضرور بائیں طرف چلی جاتی ہے گو چکی اسے دائیں جانب لیے جاتی ہے مگر وہ چکی کے پورے حلقے کو اپنی اصلی حرکت سے بائیں رُخ پر پورا کر ہی دے گی۔)

اب ان لوگوں سے دریافت کرو جو اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کی یہ ستارے جس حالت و کیفیت پر اب ہیں اسی طرح بغیر کسی خالق و صانع کے بن گئے ہیں۔ کسی نے بارادہ ان کو نہیں بنایا ہے کہ آخر کس چیز نے روک دیا تھا کہ تمام ستارے ثوابت ہی نہ ہوں گے یا سب کے سب سیارے نہ ہوں گے۔ (ایسا کیوں ہوا کہ کچھ تو غیر متحرک ہوئے اور کچھ متحرک، اس کا سبب کیا ہے) کیونکہ بغیر خالق کے پیدا ہو جانا تو امر واحد ہے۔ (اس میں اختلاف کیسا؟) تو یہ دو مختلف حرکتیں خاص انداز و مقدار پر کیوں ہوتی ہیں (کمی زیادتی کیوں نہیں ہوتی، ایک ہی رفتار سب کی کیوں نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے ستاروں کی اس طور پر گردش جواب ہے کسی ارادے، تدبیر، حکمت اور تقدیر (اندازہ) سے ہوئی ہے مہمل یعنی بغیر خالق کے نہیں ہے جیسا کہ ان معطلین (دہریوں) کا دعویٰ ہے۔

اب اگر کوئی معترض یہ کہے کہ "پھر بعض ستارے ثوابت کیوں ہوئے اور بعضے سیار کیوں ہیں؟"

تو ہم اس کو یہ جواب دیں گے کہ اگر سب کے سب ثوابت ہوتے تو وہ شناختیں اور

دلالتیں نہ رہ جاتیں جو ان سیارات کے ایک برج سے دوسرے برج میں جانے اور منتقل ہوتے رہنے سے معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ عالم کی بہت سی اشیاء حادثہ آفتاب اور باقی ستاروں کے اپنے اپنے منازل میں منتقل ہوتے رہنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ (جیسا کہ منجمین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے)۔ (لہٰذا وہ فائدے جو اب صرف چند ستاروں کے متحرک ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً فصلوں کا معلوم کرنا، حوادث کا پتہ لگانا، وغیرہ وغیرہ وہ فوت ہو جاتے) اور اگر سب کے سب سیار اور متحرک ہوتے تو ان کی معروف منزل اور کوئی علامت نہ ہوتی کیونکہ اگر واقفیت ہوتی ہے تو اسی سے کہ کواکب سیارے اپنے اپنے معین برجوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ کسی راہ چلنے والے کی رفتار کا اندازہ منزلوں سے ہوتا ہے (کہ ایک منزل چلا ہے یا دو منزل یا چار منزل)۔ اگر میل، کوس یا منزلیں نہ بنی ہوتیں تو ان کی رفتار کا اندازہ نہایت دشوار تھا۔

علیٰ ہذا القیاس، اگر یہ ستارے سب متحرک ہوتے اور ان کی حرکتیں بھی مختلف ہوتیں۔ تو ان کی رفتار کا اندازہ ناممکن ہوتا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ یہ لاکھوں ہی ہیں، کہاں تک کوئی محاسب یا منجم ان کا حساب لگا سکتا تھا؟ دوسرے اس وجہ سے کہ کوئی مشرق میں ہے کوئی مغرب میں، کوئی شمال میں ہے تو کوئی وسط میں، کوئی انتہا میں ہے، کوئی ابتداء میں، لہٰذا ان کے منازل مقرر کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔

تیسرے اس وجہ سے کہ ان سب کا بارہ بروج مشہورہ میں سے ہو کر جانا ہی محال ہے لہٰذا اندازہ بھی ناممکن ہوتا، تو غرض اصلی جو ان کے موجود ہونے اور حرکت کرنے سے ہے سب لغو اور مہمل ہو جاتی۔)

اور اگر سب کے سب ایک ہی حالت پر حرکت کرتے ہوتے تو ان کا نظام ایک دوسرے سے مخلوط ہو کر وہ اغراض جو ان میں قرار دی گئی ہیں فوت ہو جاتیں۔

اور پھر کسی کہنے والے کو یہ بھی حق حاصل ہوتا کہ وہ یہ کہہ سکتا، ان کا ایک ہی حالت پر حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی مدبر و خالق نہیں ہے جس طرح ہم (اس اختلاف رفتار سے) اس کا وجود ثابت کر آئے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ان کے اختلاف رفتار و تغیرات اور ان کی حرکتوں کے اغراض و مصلحت میں کھلی ہوئی دلیل اس بات کی ہے کہ ان میں تدبیر و ارادہ سے کام لیا گیا ہے۔ (کسی مدبر خالق نے ان کو باقاعدہ حرکت دی ہے اور اختلاف حرکت قائم کیا ہے تاکہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں)۔

ان ستاروں کی بابت غور کرو جو سال کے کسی حصے میں ظاہر ہوتے ہیں اور کسی سال چھپ جاتے ہیں، جیسے ثریا، جوزا، دونوں ستارہائے شعری اور سہیل، اگر یہ تمام ستارے ایک وقت میں ظاہر ہوا کرتے تو ان میں سے کوئی ایسی نشانی نہ بن سکتا جسے لوگ پہچانتے اور جانتے اور اپنے امور میں اس سے ہدایت پاتے۔ جیسے کہ اب ثور و جوزا وغیرہ کے طلوع و غروب سے (واقعات وغیرہ) کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

لہٰذا ہر ایک کا طلوع و غروب خاص خاص موقعوں میں اس لیے قرار پایا کہ لوگ ان باتوں سے فائدہ اٹھائیں جنہیں یہ ستارے علیحدہ علیحدہ بتاتے ہیں اور جیسا کہ ثریا وغیرہ خاص مصلحتوں کے لیے کسی وقت طلوع کرتے اور کسی وقت غروب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بنات النعش ایسے بنائے گئے ہیں کہ ہمیشہ ظاہر ہی رہیں کبھی غروب ہی نہ ہوں کیوں کہ اس کی خاص غرض ہے۔ وہ یہ کہ، یہ ستارے بمنزلۂ ایک نشان کے ہیں جن سے لوگ جنگل اور دریا میں نامعلوم راہوں کو معلوم کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے اس لیے جب انسانوں کو کوئی راہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو فوراً ان کی مدد سے راہ معلوم کر لیتے ہیں۔

یہ دونوں باتیں باوجود اپنے اختلاف حالات کے غرض اور مصلحت ہی میں صرف کی

گئی ہیں (کوئی ان میں سے بیکار یا نقصان دہ نہیں ہے۔)

(علاوہ بریں) اس میں بہت سے کاموں کے اوقات کی شناخت دلالت ہے مثلاً زراعت، باغبانی، خشکی یا دریا کا سفر اور دیگر چیزوں کی بھی شناخت ہوتی ہے جو مختلف زمانوں میں ہوتے رہتے ہیں مثلاً بارش کا برسنا، ہواؤں کا چلنا، گرمی کا ہونا، جاڑوں کا آنا۔

نیز اندھیری راتوں میں چلنے والے، وحشت ناک میدانوں اور خوف ناک دریاؤں میں ان سے راہ پاتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ ستارے جو آسمان پر کبھی آگے کو چلتے ہیں تو کبھی پیچھے کو ہٹتے ہیں، کبھی مغرب کی طرف جاتے ہیں اور کبھی مشرق کی جانب اس میں بھی بہت سی عبرتیں ہیں۔

چونکہ چاند اور سورج دونوں کواکب نہایت تیز رفتاری سے چلتے ہیں تو اگر ہم سے قریب ہوتے اور ہمیں ان کی سرعت رفتاری کا صحیح اندازہ ہوتا تو کیا تمہارا خیال ہے کہ اس ضیاء وشعاع سے لوگوں کی آنکھیں خراب نہ ہو جاتیں جیسے بعض اوقات بجلی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں جبکہ وہ کبھی چمکتی ہے اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اگر چند آدمی ایسے مکان میں ہوں جس کی چھت میں بہت سی قندیلیں نہایت روشن ہوں اور بہت تیز رفتاری سے ان کے سروں کے گرد گرش کر رہی ہوں تو ضرور ان کی آنکھیں پتھرا کر خیرہ و تار ہو جائیں گی اور یہ لوگ چکر کھا کر گر پڑیں گے۔ (پس اگر اس سرعت رفتاری کے ساتھ ستارے ہمارے سر کے قریب ہوتے اور تیزی سے ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے ہوئے چلتے تو کسی طرح بھی ان پر نظر نہ ٹھہر سکتی اور لوگ گھبرا گھبرا کر گر پڑتے)۔

تو دیکھو! کہ کس طرح یہ بات مقرر کر دی گئی کہ ان کی رفتار ہم سے بہت فاصلے پر ہوتا کہ نگاہوں کو نقصان نہ پہنچے اور کوئی بیماری پیدا نہ ہو، اور اس قدر تیز رفتار اس لیے بنائے گئے کہ جس قدر ان کی سیر و رفتار کی ضرورت ہے اس میں بھی خلل واقع نہ ہو۔

ان ستاروں میں تھوڑی سی روشنی دی گئی، تاکہ جب چاند نہ ہو تو یہ اس کی جگہ پر روشنی کا کام دیں، اور جب چلنے پھرنے کی ضرورت ہو تو اندھیری رات کے گھپ اندھیرے سے گھبرا نہ جائیں اور ان کی ضو میں چلنا پھرنا ممکن اور آسان ہو سکے۔ چنانچہ آدمی کو کبھی اس بات کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ وہ شب میں چلے پھرے، اگر کچھ بھی روشن نہ ہوتا، جس سے وہ راہ تلاش کرتے تو اس کو اپنے مقام سے حرکت بھی دشوار ہو جاتی۔

اس لطف و حکمت پر غور کرو جو اس قسم کی خلقت و تقدیر (ایک خاص اندازہ پر کسی چیز کو بنانا) میں قائم کی گئی ہے۔ تاریکی کی بھی مدت قرار دی گئی ہے کیونکہ اس کی ضرورت تھی اور اس کے اندر یہ ضو بھی قرار دی گئی جس سے وہ اغراض پورے ہوں جنہیں ہم نے بیان کیا۔

اس فلک پر مع اس کے آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور برجوں کے غور کرو جو ایک خاص اندازہ اور مقدار کے ساتھ جہان کے گرد اپنی اس دائمی گردش سے پھرتے رہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ رات، دن اور ان چاروں فصلوں کے اختلاف میں خود زمین اور زمین کے رہنے والے مختلف حیوانات اور نباتات کے لیے بہت سی مصلحتیں ہیں۔

کیا کوئی صاحب عقل و فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی بہترین تدبیر و اصلاح جس سے نظام عالم میں درستی و حکمت قائم رہے بغیر کسی مقتدر حکیم کے ہو گئی ہے۔

پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ بخت و اتفاق سے ایسا ہو گیا ہے (کسی خالق کی حکمت و تدبیر اس میں نہیں ہے) تو یہی بات وہ اس دولاب (چرخ یا رہٹ، جس سے پانی کنوئیں سے کھینچ کھینچ کر باغوں وغیرہ میں پہنچایا جاتا ہے) کی بابت بھی کیوں نہیں کہتا جسے وہ پھرتے ہوئے اور کسی ایسے باغ کو سینچتے ہوئے، جس میں درخت اور نباتات لگے ہوئے ہیں، دیکھتا ہے (اس میں بھی یہی کہہ دینا چاہیے کہ یہ رہٹ تو خود بخود ہی چلتا ہے، خود بخود بن گیا ہے اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے) کیونکہ اس کے بھی تمام آلات کو وہ دیکھتا ہے کہ معین

اندازے سے بنائے گئے ہیں اور ایک جزو دوسرے جزو سے اسی قاعدے پر ملا ہوا ہے جس میں اس باغ کی اور اس کے اندر کی چیزوں کی بہتری ہے۔ اور اگر وہ یہی بات اس دولاب کی بابت بھی کہے (کہ یہ خود بخود ہی بن گیا ہے۔) تو کیوں کر اس کے لیے یہ ثابت کیا جائے گا کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ اور تمہارے نزدیک لوگ ایسے کہنے والے کو کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے کہ اے احمق بدمغزے، بیوقوف، خردماغ دیکھتا نہیں کہ رہٹ کی طبیعت اور اس کا مادہ جو خود بے عقل و بے ادراک چیز ہے کیا ایسا کرسکتا ہے کہ اس اندازے اور ترتیب کے ساتھ باغ کی تمام مناسبتوں کے لحاظ سے ایسا رہٹ بنا دے؟ کیا کوئی عقل اسے تسلیم کرے گی؟)

کیا ایک لکڑی کے بنے ہوئے رہٹ میں جو تھوڑی سی تدبیر و حکمت سے صرف ایک قطعۂ زمین کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے اس بات کے کہنے سے انکار کرے گا کہ اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ کسی نے اسے باندازہ و حکمت نہیں بنایا ہے۔ اور اتنے بڑے رہٹ (چرخ آسمان) کی نسبت جو ایسی ایسی حکمتوں کے ساتھ بنا ہے جس کے سمجھنے سے انسانی ذہن عاجز ہے اور جس میں تمام روئے زمین اور اس پر کل چیزوں کا فائدہ ہے، کہہ سکے گا کہ یہ ایک اتفاقی چیز ہے۔ بخت و اتفاق سے بے صناعی اور بے تقدیر و اندازہ بن گیا ہے اگر آسمان کی کوئی کل ویسے ہی بگڑ جائے جیسے لکڑی کے بنے ہوئے آلات بگڑ جاتے ہیں تو انسانوں کے پاس کوئی ایسی تدبیر ہے جس سے اس کو ٹھیک کرسکیں؟ (توبہ لا حول ولا قوۃ الّا باللہ، خیال تک بھی نہیں ہوسکتا تدبیر کیسی۔ یہ تو دہریوں کی صرف ہٹ دھرمی ہے جو ایسا کہتے ہیں ورنہ بھلا کہیں عقل بھی ایسی احمقانہ بات کہنے کی رائے دے سکتی ہے؟)

دن اور رات کے بارے میں

مفضل! ذرا رات و دن کی مقدار پر غور کرو کہ مخلوقات کی بہتری کے واسطے کس طور پر قائم ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کی حد جب پندرہ گھنٹے تک پہنچ جاتی ہے تو پھر

اس سے زیادہ نہیں بڑھتے (حضرت کا یہ ارشاد معظم بلاد اور معمورات کی نسبت سے ہے ورنہ عرض ثمانین وتسعین یعنی اَسّی اور نوے درجے عرض البلد پر قطب کے قریب تو تقریباً چھ چھ مہینے کے دن اور رات ہوتے ہیں)۔

(حضرت نے صرف ان مقامات کا ذکر فرمایا ہے جہاں آبادی ہے، نہ وہاں کا جہاں کسی جاندار کا رہنا ہی تقریباً محال ہے۔)

کیا تم جانتے ہو کہ اگر دن کی مقدار سو یا دو سو گھنٹوں کی ہو جاتی تو تمام حیوانات و نباتات فنا نہ ہو جاتے۔ (یقیناً مر جاتے اور فنا ہو جاتے) حیوانات تو اس وجہ سے کہ اس طویل مدت میں نہ دم لیتے نہ آرام وقرار ملتا، اور بہائم بھی چرنے سے باز نہ آتے (اگر ان کو دن کی اتنی طولانی روشنی ملا کرتی) آدمی بھی کام نہ چھوڑتے اور نہ چلنے پھرنے سے باز آتے) لہٰذا سب کے سب (تھوڑے زمانے میں) ہلاک اور تلف ہو جاتے۔

رہے نباتات، جب ان پر اتنی دیر تک دن کی گرمی اور آفتاب کی تمازت پڑتی تو خشک ہو کر جل جاتے۔

علیٰ ہذا القیاس، رات ہے کہ اگر اسی قدر (سو یا دو سو گھنٹے) بڑھ جاتی تو تمام قسم کے حیوانات کو چلنے پھرنے اور طلب معاش میں کوشش کرنے سے باز رکھتی، یہاں تک کہ بھوکے ہی مر جاتے، اور نباتات کی تو حرارت طبیعہ (حرارت عزیزیہ) ہی فنا ہو جاتی، یہاں تک کہ ان میں عفونت (بدبو) پیدا ہو جاتی اور پھر وہ خراب ہو جاتے۔ جیسا کہ تم ان نباتات کو دیکھتے ہو جو ایسے مقامات پر ہوتے ہیں جہاں دھوپ نہیں پڑ سکتی۔

گرمی اور سردی کے بارے میں

اس گرمی اور سردی پر غور کرو! کہ اپنے کم اور زیادہ اور اعتدال اور سال کی چاروں فصلوں کے قائم کرنے کے لیے کس طور پر تمام عالم میں یکے بعد دیگرے آتی جاتی اور اس قسم

سے اپنا عمل کرتی ہیں اور دیکھو کہ ان میں مصلحت کیا ہے۔

پھر یہ بھی کہ اجسام کی اصلاح اور دباغت بھی اسی میں ہے (جس سے بظاہر مراد یہ ہے کہ فصلوں کے بدلنے کے ساتھ جسم کی ہلکی ہلکی جھلیاں بھی اتر کر دوسری جھلی اور نئی کھال پیدا ہوتی ہے) جس سے ان کی بقاء و درستی قائم ہے کیونکہ اگر یہ گرمی اور سردی نہ ہوتی اور اجسام پر یکے بعد دیگرے ان کا توارد نہ ہوتا رہتا تو خراب و فاسد ہو جاتے، ٹوٹ پھوٹ جاتے دبلے اور لاغر ہو جاتے۔

ان دونوں (گرمی اور سردی) کے بتدریج ایک دوسرے میں داخل ہو جانے پر غور کرو! تم دیکھتے ہو گے کہ ان میں سے ایک تو تھوڑی کم اور دوسری تدریجا بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی کمی اور زیادتی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر ایک دوسری پر اچانک و یکبارگی وارد ہوتی (یعنی یکدم گرمی بڑھ جاتی سردی یکدم کم ہو جاتی یا سردی بڑھ جاتی اور گرمی یکدم کم ہو جاتی) تو بدنوں کو اس سے سخت نقصان پہنچتا اور بیمار ہو جاتے، جیسے کوئی شخص کسی گرم حمام سے یکبارگی سرد مقام پر چلا آئے تو اسے اس سے نقصان پہنچے گا اور وہ بیمار ہو جائے گا۔

لہذا، خالق عزوجل نے گرمی اور سردی کی یہ تدریج قائم کی تا کہ اس کی مخلوق اس نقصان سے بچ جائے۔ اور یہ کام تدبیر وحکمت سے خالی نہیں (پس اگر کوئی مدبر وحکیم اس تدبر وحکمت کا نہ ہوتا تو کون اس بات پر تفکر کرتا کہ گرمی یکبارگی نہ پڑنے لگے یا سردی یکبارگی نہ آ جائے کہ اس میں جہان کے اجسام وابدان کا نقصان ہے)۔

اگر کوئی مدعی اس بات کا دعویٰ کرے کہ گرمی و سردی کی آمد میں یہ تدریج و آہستگی آفتاب کی رفتار سے ہے کہ جس قدر بلند ہوتا رہتا اور نیچے کو جھکتا رہتا ہے اسی قدر دن میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے تو اس سے یہ سوال کیا جائے گا کہ آفتاب کی رفتار اور بتدریج بلندی و پستی کی طرف آنے کا سبب کیا ہے؟ پھر اگر وہ یہ کہے کہ اس کا سبب مشرق ومغرب کا فاصلہ

ہے، تو اس سے یہ سوال کیا جائے گا کہ، ایسا کیوں ہوا؟ تو یہ سوال اسی طرح ہوتا رہے گا یہاں تک کہ وہ خود ہی قائل ہو جائے گا کہ ضرور اس میں اختیار عمد و تدبیر سے کام لیا گیا ہے (از خود ایسا نہیں ہوا)۔

دیکھو! اگر گرمی نہ ہوتی تو سخت اور کڑوے پھل کبھی پکتے اور نرم اور شیریں نہ ہوتے جس سے تر اور خشک دونوں حالتوں میں پختگی اور رسیلہ پن حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر سردی نہ ہوتی تو زراعت میں اس قدر بالیاں نہ نکلتیں اور نہ اس کثرت سے پیداوار ہوئی جو غذا اور تخم پاشی کے لیے کافی ہو سکتی۔

کیا تم دیکھتے نہیں! کہ گرمی اور سردی میں کس قدر فوائد ہیں اور باوجودیکہ ان دونوں میں بہت سے فوائد ہیں پھر بھی بدنوں کو ان سے تکلیف ہوتی ہے۔ (حالانکہ یہ تکلیف بھی فائدوں سے خالی نہیں) اور اس میں غور کرنے والوں کے لیے عبرت ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تمام کام عالم اور اہل عالم کی بہتری کے لیے کسی حکیم و دانا کی تدبیر سے ہوئے ہیں۔

ہوا کی حکمتیں

مفضل! میں تم کو ہوا اور اس کی حکمتوں سے باخبر کرتا ہوں۔

کیا تم نہیں دیکھتے! کہ جب یہ ٹھہر جاتی ہے تو کیسی بے چینی پیدا ہوتی ہے جو جان لینے کے قریب ہو جاتی ہے۔ تندرست آدمیوں کو بیمار اور مریضوں کو لاغر، پھلوں کو خراب، اشیاء کو متعفن کر دیتی ہے۔ بدنوں میں وبا، غلوں میں خرابی پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہوا کا چلنا مخلوقات کی بہبودی کے لیے حکیم کی تدبیر سے ہے (نہ کہ از خود)۔

ہوا کی ایک اور خاصیت تم سے بیان کرتا ہوں۔

آواز، ایک اثر (و کیفیت ہے) جو اجسام کے باہم ہوا میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے اور ہوا اس کو کانوں تک پہنچاتی ہے۔ (یہ مسئلہ بھی مسلمات فلاسفہ میں سے ہے کہ جب تک

ہوا میں تموج (لہر) پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک آواز نہیں سنائی دیتی) اور تمام انسان اپنی ضروریات اور معاملات کے متعلق دن بھر اور رات کے کچھ حصہ تک گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ تو اگر اس کلام کا اثر ہوا میں باقی رہتا، جیسے تحریر، کاغذ پر لکھی جاتی ہے تو تمام عالم اس سے بھر جاتا اور اس سے اہل زمین کو بے چینی پیدا ہوتی، گرانی ہوتی، اور ان کو اس بات کی ضرورت ہوتی کہ ہوا بدل جائے اور نئی ہوا آئے (جس میں نئے کلام شروع ہوں کیونکہ پہلی ہوا تو آوازوں سے بھری ہوئی ہے اور کان اس سے مملو ہیں۔ لہٰذا نئی باتوں کے لیے کسی اور ہوا کی ضرورت ہوتی) اور یہ ضرورت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جو کاغذ کی تبدیلی میں ہوتی ہے کیونکہ تحریر کی بہ نسبت زبانی باتیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ لہٰذا خلاق حکیم جل قدرتہٗ نے اک ایسا خفی کاغذ بنایا ہے جو کلام کا اتنی دیر تک حامل رہے جتنی دیر میں اہل عالم کی ضرورت پوری ہو اور اس کے بعد ختم ہو جائے اور وہ ویسی ہی نئی کی نئی، صاف ستھری ہو جائے، اور ہمیشہ ان کلاموں کی متحمل ہوتی رہے جو اس میں واقع ہوتے ہیں۔

تمہارے لیے تو یہی نسیم، جسے ہوا کہتے ہیں اور اس میں جو مصلحتیں ہیں، عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ہوا اجسام وابدان کی زندگی کا باعث ہے اور بیرونی جانب سے جب ہم اسے سانس کے ذریعے سے جذب کرتے ہیں اور اندرونی جانب سے جب یہ روح سے ملتی ہے تو حیات کو قائم رکھنے والی ہوتی ہے۔ (اگر سانس کے ذریعے سے تازہ ہوا پھیپھڑوں تک نہ جائے اور اندرونی بخارات نہ نکلتے رہیں تو چند لمحوں میں آدمی مر جائے۔) اسی ہوا کے اندر آوازیں واقع ہوتی ہیں جنہیں دور دور تک پہنچا دیتی ہے، یہی ہوا ایک مقام سے دوسرے مقام پر خوشبوؤں کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ دیکھو! جب ہوا چلتی ہے تو تمہاری ناک تک طرح طرح کی خوشبوئیں اڑا اڑا کر لاتی ہے۔ اسی طرح آواز کو بھی ایک جگہ سے دوسرے مقام تک پہنچاتی ہے۔ اور یہی ہوا گرمی و سردی کی بھی حامل ہوتی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے

بہبودیٔ عالم کے لیے آتی، جاتی رہیں (یعنی سردی اور گرمی اسی ہوا میں قائم رہتی ہیں، اگر عالم میں نہ ہوتیں تو کبھی گرمی اور سردی بھی نہ ہوتیں۔ فلسفۂ طبعیات پڑھو، تب تم کو اس کا لطف حاصل ہوگا)۔

اسی سے چلنے والی ہوا بھی پیدا ہوتی ہے۔ (جس کی حرکت بدنوں کو محسوس ہوتی ہے اور جو درختوں کو ہلاتی ہے) جو اجسام سے فسادات وخرابیوں کو دفع کرتی، اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر اَبر کو اڑا کر لے جاتی ہے تاکہ اس کا فائدہ عام ہو اور وہ گھرے (دبیز اور تہہ بہ تہہ) ہوں تاکہ ان سے بارش ہو۔ پھر انہیں منتشر کر کے ہلکا بادل کر دیتی ہے تو منتشر ہو جاتے ہیں۔

درختوں میں پھل پھول پیدا کرتی، کشتیوں کو چلاتی، غذاؤں کو نرم ولطیف بناتی، پانی کو ٹھنڈا کرتی، آگ کو بھڑکاتی اور تر چیزوں کو خشک کرتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین کی تمام چیزوں کو قائم و زندہ رکھتی ہے۔ اگر یہ چلنے والی ہوا نہ ہو تو نباتات خشک (پژمردہ) ہو جائیں، حیوانات مر جائیں اور تمام چیزیں خراب و بیکار ہو جائیں۔

زمین کے بارے میں

مفضل! خدائے تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ان جواہر اربعہ (عناصر اربعہ) میں فکر کرو، جنہیں اس نے اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ جو ضرورت ان کی ہے وہ بفراغت پوری ہو۔ منجملہ ان کے یہ زمین اور اس کی چوڑائی ہے۔ پس اگر یہ زمین اتنی چوڑی نہ ہوتی تو آدمیوں کے مکانات، زراعتیں، چراگاہیں اور جنگلوں، بنوں، بڑی قدر والی جڑی بوٹیوں اور معدنیات گراں قیمت کے لیے کیوں کر کافی ہوتی؟

شاید ایک شخص ان چٹیل میدانوں اور وحشت ناک بیابانوں سے نفرت کرے اور کہے کہ ان میں فائدہ ہی کیا ہے؟

جواب میں (اس سے یہ کہا جائے گا) کہ یہی تو وحشی جانوروں کے رہنے کی جگہ، محل قیام و آرام اور ان کی چراگاہیں ہیں۔ پھر یہ کہ آدمیوں کے لیے ایک وسیع جگہ حاصل ہے۔ اگر وہ اپنے وطنوں کو تبدیل کرنا چاہیں تو یہاں آ کر آباد ہو سکتے ہیں۔ کتنے ہی بیابان اور میدان تھے جن میں محلات بن گئے اور آدمیوں کے ان میں مستقل آباد ہو جانے سے کتنے ہی باغات وغیرہ لگ گئے اور اگر زمین کی اتنی وسعت نہ ہوتی تو آدمی ایسے ہوتے جیسے کسی تنگ قلعے میں بند کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی امر ان کو اس بات پر مجبور کرتا، کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہوں۔ تو ان کو کوئی چارۂ کار نہ ہوتا سوائے اس کے کہ اسی اپنے تنگ وطن ہی کو مجبوراً آباد رکھیں اور وہیں پڑے رہیں۔

پھر یہ غور و فکر کرو کہ زمین جو اس حالت پر پیدا کی گئی ہے جس پر اب ہے، کس طور سے قائم و ساکن پیدا کی گئی ہے کہ تمام چیزوں کے لیے جائے استقرار اور وطن ہو سکے۔ اسی وجہ سے انسان اپنی ضرورتوں کے لیے اس پر چلنے پھرنے اور آرام کے لیے بیٹھنے، راحت پانے، کھیتی بونے اور اپنے کاموں کو استحکام کے ساتھ کرنے پر قادر ہو سکے۔ ورنہ اگر یہ متحرک یا ادھر ادھر سے جھکی رہتی تو کبھی ان کو ممکن نہ ہوتا کہ اس پر کوئی مضبوط عمارت بنا سکتے، اس پر اپنے دوسرے کام کر سکتے بلکہ ایسی صورت میں جبکہ زمین ہر وقت ہلتی ہی رہتی، ان کی زندگی بھی دوبھر ہو جاتی، اور لوگ چلنے پھرنے سے بھی عاری ہو جاتے۔ اسے ان زلزلوں کی طرح سمجھو جو تھوڑی ہی دیر کے لیے رونما ہوتے ہیں۔ پھر جن لوگوں پر ان کا اثر پڑتا ہے وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ (پس اگر ہر وقت زمین حرکت کیا کرتی تو کس طرح کوئی کام ہو سکتا تھا)۔

اگر کوئی معترض یہ کہے کہ آخر زمین کو زلزلہ کیوں آتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زلزلہ اور نیز ایسی ہی دوسری چیزیں۔ (مثلاً سخت آندھی، گہن کا لگنا، بے حد ستاروں کا ٹوٹنا، آسمان پر خوفناک سرخی کا نمودار ہو جانا، وغیرہ وغیرہ) ایک

قسم کی نصیحت اور تخویف ہیں۔ تا کہ لوگ ان چیزوں سے ڈر کر گناہوں سے باز آئیں۔

علیٰ ہذا القیاس، جو آفتیں اور بلائیں ان کے اجسام و ابدان اور مال پر وارد ہوتی ہیں وہ بھی اسی حکمت سے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لیے بہبودی و بہتری اور درستی احوال ہے۔ اگر وہ (ان چیزوں سے عبرت حاصل کر کے) نیک بن جائیں، گناہوں سے تائب ہو جائیں، تو ان کو ثواب و جزا کا ذخیرہ آخرت میں اتنا ملے گا جس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ثواب ان کو دنیا ہی میں فوراً دے دیا جاتا ہے۔ (یعنی خدائے تعالیٰ کے نزدیک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام وخواص کی بہبودی اس میں پوشیدہ ہے)۔

پھر یہ زمین بذاتِ خود بارد و یابس ہے (ٹھنڈی اور خشک ہے) اسی طرح پتھر بھی بارد و یابس ہے۔ (اس میں اور پتھر میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ پتھر میں زمین کی بہ نسبت زیادہ خشکی ہے۔ تو کیا تم جان سکتے ہو کہ اگر تھوڑی سی خشکی اور زمین میں پیدا کر دی جاتی تو وہ بھی پتھر ہو جاتی۔ تو پھر نباتات کیسے پیدا ہو سکتے تھے کہ جس پر حیوانات وغیرہ کی زندگی کا انحصار ہے۔ نہ کھیتی ہی کے قابل ہوتی اور نہ عمارت ہی بنائی جا سکتی۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس کی پیوست پتھر کی بہ نسبت کس قدر کم ہے نرمی و رخاوت اس میں قرار دی گئی ہے تا کہ باعتماد ضروری کام سرانجام پا سکیں۔

زمین کی خِلقت میں حکیم جل قدرتہٗ نے ایک یہ بھی حکمت رکھی ہے کہ شمالی جانب بہ نسبت جنوبی جانب کے بلند ہے۔ پھر خدائے عزوجل نے ایسا کیا ہی کیوں؟ اسی لیے نا، تا کہ پانی تمام روئے زمین پر بہہ کر اسے سیراب کر سکے اور آخر میں سمندر کی طرف بہہ جائے۔ جیسے مکان کی چھت کو ایک طرف سے قدرے بلند اور دوسری جانب سے پست کر دیا جاتا ہے تا کہ بارش کا پانی رُکنے نہ پائے اور بہہ کر نکل جائے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو پانی تمام روئے زمین پر پھیل جاتا جس کی وجہ سے لوگوں کا کام

رک جاتا، کوئی کام بھی نہ کیا جا سکتا، راستے کٹ جاتے (اس سے زمین کی گولائی میں فرق نہیں آتا، اس لیے کہ زمین اگرچہ واقعاً گول ہے لیکن اسی کے ساتھ پانی کے کرے سے نیچے ہے اور پانی دراصل اس سے اوپر ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے صرف اسی لیے کہ اس پر بھی چند قسم کی مخلوقات کی تخلیق ہو سکے اور وہ اس پر رہ کر زندہ رہ سکیں، اس کا نصف شمالی حصہ پانی سے بلند کر دیا ہے اور باقی پانی میں غرق ہے تاکہ اس جزیرہ نما حصے میں آبادی ہو سکے۔

علیٰ ہذا القیاس دوسرے جزائر بھی اسی غرض سے پانی کے اوپر کر دیے گئے ہیں۔ ورنہ باقاعدہ اس سے اوپر پانی ہونا چاہیے تھا اور اسے اس کے نیچے رہنا چاہیے تھا۔ اگر اس مسئلے کو خوب سمجھنا چاہتے ہو تو علم ہیئت کی کتابیں دیکھو۔

پانی کی خصوصیات

یہ پانی (منجملہ عناصر اربعہ کے تیسرا عنصر ہے) اگر اس کثرت سے نہ ہوتا اور چشموں، وادیوں اور نہروں کے ذریعے سے نہ بہتا تو انسانوں کو جو اپنے چوپاؤں اور مویشیوں کو پلانے، زراعتوں اور درختوں کو سیراب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس میں بہت بڑی تنگی واقع ہوتی۔ اور نیز، وحوش و طیور اور درندے پیتے ہیں یا مچھلیاں اور پانی کے جانور اس میں رہتے ہیں ان کے لیے سخت مشکل اور تکلیف ہو جاتی۔

اس کے علاوہ اس میں اور بھی فوائد ہیں جنہیں تم جانتے تو ہو مگر ان کی عظمت اور وقعت سے غافل ہو۔ تو دیکھو کہ علاوہ اس بزرگ اور گرانقدر فائدے کے جو اس میں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسی کے ذریعے سے تمام روئے زمین کے حیوانات اور نباتات زندہ ہیں۔ یہ دیگر بہت سی پینے کی چیزوں میں بھی شامل کیا جاتا ہے۔ (مثلاً ستو اور دوا وغیرہ) تاکہ وہ نرم ہو جائیں اور پینے والے کو گوارا معلوم ہوں۔ اسی سے بدن اور لباس کا میل صاف کیا جاتا ہے۔

اسی سے مٹی گوندھ کر ظروف وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اسی سے آگ کا ضرر دفع کیا جاتا ہے وہ جب کبھی مشتعل ہو جائے، اور لوگ اس سے تکلیف پانے لگیں۔ اسی سے تھکا ہوا آدمی اپنی تعب و تکلیف سے آرام پاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سے اغراض ہیں جن کی عظمت قدر کو تم اسی وقت جان سکتے ہو جب اس کی ضرورت پڑے۔

پھر بھی اگر تم کو کچھ شک پڑتا ہو کہ اس قدر کثیر پانی کیوں دریاؤں میں پیدا کیا گیا اور کہو کہ اس سے کیا فائدہ ہے؟

تم کو معلوم ہو کہ یہی پانی دریا کے بہت سے قسم کے جانوروں اور مچھلیوں کا ماویٰ اور مسکن ہے۔ یہی موتی، یاقوت، عنبر اور انواع و اقسام کی چیزوں کا معدن ہے جو دریاؤں سے نکالی جاتی ہیں۔ اسی کے کنارے پر عود، بخوری اور طرح طرح کی خوشبودار چیزیں اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ (اگر اس کثرت سے پانی نہ ہوتا تو یہ چیزیں کیوں کر پیدا اور مہیا ہو سکتی تھیں۔) علاوہ ازیں یہ بھی کہ آدمیوں کی سواری ہے (اس پر سوار ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں) ان تجارتوں کا ذریعہ ہے جو دور دور کے شہروں سے وابستہ ہیں مثلاً چین سے عراق اور وہاں سے چین، بصرہ، کوفہ، دجلہ، اور فرات کے ذریعے سے وغیرہ وغیرہ) اگر سوائے پشت انسان و حیوان کے اور کوئی ان تجارتی اشیاء کا متحمل نہ ہوتا تو تجارت خراب ہو جاتی اور اشیاء اپنے ہی شہروں میں رہ جاتیں اور اپنے ہی ملک والوں کے ہاتھ میں رہتیں۔ کیونکہ ان کی باربرداری کی اجرت ان کی قیمتوں سے زیادہ ہو جاتی پھر تو کوئی بھی ان کے کہیں لے جانے کا ارادہ نہ کرتا۔ اور اس سے دو خرابیاں پیدا ہو جاتیں۔

اول یہ کہ بہت سی ایسی چیزیں نہ مل سکتیں جن کی آدمیوں کو ضرورت پڑتی ہے مثلاً دوا میں ایک سنائے مکی ہے یا عود چینی ہے یا آلو بخارا ہے یا بلاد یورپ و ایشیا کی غذائی یا دوائی دیگر اشیاء ہیں۔ اگر یہ صرف پیٹھ ہی پر لاد کر لائی جایا کرتیں سمندر و دریاؤں کا درمیانی واسطہ

نہ ہوتا جن میں کشتیوں کے ذریعے سے لاتے ہیں تو یہ چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح پہنچ سکتی تھیں)۔

۲۔ ان لوگوں کی معاش کا سلسلہ قطعی ہو جاتا جن کی زندگی معاشی طور پر اسی ذریعے سے منسلک اور بسر ہوتی ہے۔

اسی طرح ہوا ہے کہ اگر اس کثرت سے نہ ہوتی تو تمام آدمیوں کا دم اس دھوئیں اور بخارات سے گھٹ جاتا جو اس فضا میں بھرے رہتے ہیں، اور نہ اس میں اس قدر وسعت ہوتی کہ اس سے گہرے اور ہلکے بادل بن سکتے جو اب ہوا کے استحالہ سے آہستہ آہستہ ابر بن جایا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بیان کیا جا چکا ہے۔

آگ کے عنصر کا بیان

آگ کا بھی یہی حال ہے (کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ ضرورت کے موافق بنائی گئی ہے۔) کہ اگر یہ پانی اور ہوا کی طرح پھیلی رہتی تو سب کچھ تباہ ہو جاتا، اور کوئی چارۂ کار اس سے نہ تھا کہ اوقات معینہ پر اس کا ظہور ہوا کرتا، کیونکہ اکثر کاموں میں اس سے فائدہ ملتا ہے۔ لہٰذا اس کا خزانہ لکڑیوں میں جمع کیا گیا ہے جو ضرورت کے وقت ہی نکالی جاتی ہے اور پھر اس کو اس کے مادہ اور لکڑیوں کے ذریعے س قائم رکھا جاتا ہے۔

پس نہ تو یہ ایسی ہے کہ ہمیشہ ہی لکڑی اور مادے کے ذریعے سے باقی رکھی جائے، اور نہ تمام عالم میں اس طرح پھیلی رہتی ہے کہ تمام اشیاء کو جلا دے۔ بلکہ ایک خاص اندازے کے ساتھ تہیتۂ قائم رکھی گئی ہے تاکہ اس کی منفعتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس کے ضرر سے بچا جا سکے۔

اس میں ایک اور صفت یہ بھی ہے کہ اس کی خصوصیت صرف آدمی سے رکھی گئی ہے حیوانوں کو اس کی ضرورت نہیں قرار دی گئی۔ اگر آگ نہ ہوتی تو بڑا سخت نقصان انسانی معاش

میں واقع ہوتا۔ (مثلاً لوہے کی اشیاء اسی کے ذریعے بنائی جاتی ہیں، کیونکہ زراعت، عمارت، صنعت کے آلات تیار کیے جاتے، زرگری میں اس کی ضرورت ہے، ظروف سازی میں بھی اسی سے مدد ملتی ہے۔ عمارات کے لیے اینٹیں اور چونا بنانے میں معاون ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تو ہر روز ہی کھانا پکانے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ (پھر اگر آگ نہ ہوتی تو انسانی زندگی کس قدر تنگ ہو جاتی)۔

لیکن رہے بہائم، وہ تو اسے استعمال نہیں کرتے اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور چونکہ ایسا ہی خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا کہ صرف آدمی ہی اس سے فائدہ حاصل کریں۔ لہٰذا انسان کے لیے ہتھیلیاں اور انگلیاں بنا دی گئیں تاکہ اس کے روشن کرنے اور استعمال کرنے میں ان سے مدد ملے اور بہائم کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں، لیکن ان کو معاش کی تکلیف پر صبر کی طاقت دی گئی تاکہ آگ کے نہ ملنے سے جو نقصان انسان کو پہنچتا وہ ان کو نہ پہنچے۔

میں تم کو اس کی ایک چھوٹی سی چیز کا نفع بتاتا ہوں جو نہایت ہی قابل قدر و وقعت ہے۔ وہ یہی چراغ ہے (جو آگ سے روشن ہوتا ہے) جسے لوگ روشن کرتے اور اس سے شب کے وقت کی ضرورتیں خواہش کے مطابق پوری کرتے ہیں۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو (شب کے وقت) آدمیوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی گویا قبرستان میں دفن ہیں تو کس سے ممکن ہوسکتا کہ کچھ لکھے، یا پڑھے اور یاد کرے۔ سینے پرونے کا کام کس طرح کرتا۔ اور اس شخص کا کیا حال ہوتا جسے شب کے کسی حصے میں کوئی درد اٹھتا یا بیماری لاحق ہوتی اور اسے مرہم لگانے یا سفوف یا کسی اور ایسی ہی چیز کی ضرورت ہوتی جس سے وہ اپنا علاج کرے اور اس سے شفا حاصل کرے۔ (تو پھر اندھیری رات میں کیا کر سکتا تھا؟ لہٰذا خدائے تعالیٰ نے آدمیوں کو یہ سکھایا کہ تم اپنی ضرورتوں کے واسطے اس ترکیب سے روشن کر لیا کرو)۔

لیکن اس کے دوسرے فوائد جو کھانا پکانے اور بدن کو گرمی پہنچانے گیلی چیزوں کو خشک کرنے اور سخت چیزوں کو نرم یا تحلیل کرنے اور علیٰ ہذا القیاس دیگر چیزوں میں ہیں وہ اس قدر ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ایسے عیاں ہیں کہ ان کے ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بارش کی خصوصیات

آسمان کے صاف ہو جانے، اور بارش کے برسنے پر غور کرو (یعنی ان دونوں مختلف حالتوں کو غور سے دیکھو کہ ایک وقت آسمان صاف ہو جاتا ہے۔ دوسرے وقت ابر چھا جاتا ہے اور بارش ہونے لگتی ہے) کیونکہ یکے بعد دیگرے اس عالم میں اس طور پر واقع ہوتے ہیں جس میں اس (عالم) کی بہتری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ رہتا تو اس سے عالم میں خرابی پڑ جاتی۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب بھی متواتر بارش ہونے لگتی ہے تو سبزیوں وغیرہ میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے، حیوانات کے بدنوں میں اِسترخا ہو جاتا ہے۔ ہوا میں برودت بڑھ جاتی ہے اور طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ راستے اور سڑکیں خراب ہو جاتی ہیں اور جب کبھی عرصے تک آسمان کھلا رہتا ہے (یعنی بارش نہیں ہوتی) تو زمین خشک ہو جاتی ہے۔ نباتات جل جاتی ہیں چشمے اور ندیوں کا پانی کم ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کو نقصان پہنچتا ہے اور ہوا میں یبوست (خشکی) پیدا ہو جاتی ہے۔ تو مختلف قسم کے امراض پیدا ہونے لگتے ہیں۔

ج لیکن جب یکے بعد دیگرے موسموں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو ہوا معتدل رہتی ہے ہر ایک ان میں سے دوسرے کے ضرر کو دفع کرتا رہتا ہے، تو تمام چیزیں باقاعدہ ٹھیک اور درست رہتی ہیں۔

اگر کوئی معترض یہ اعتراض کرے کہ پھر ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ان میں سے کسی

میں کچھ ضرر ہی نہ ہوتا۔ (یعنی اگر بارش ہمیشہ برسا کرتی تب بھی آدمیوں کو نقصان نہ پہنچتا، اگر ہمیشہ مطلع صاف ہی رہتا تو بھی ان کو کچھ ضرر نہ پہنچتا، ایسا کیوں نہ ہوا؟)

جواب یہ ہے کہ آدمی کو مکلف پیدا کیا ہے اس لیے اُسے کسی قدر تکلیف پہنچتی رہے تا کہ وہ معصیتوں سے باز رہے مثلاً جب انسان بیمار ہوتا ہے تو اسے تلخ اور بدمزہ دوائیں پینے کی ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا اس تلخی اور بدمزگی کو برداشت کرے، مرض کی تکلیف برداشت کرے سرکشی، کبر اور غرور نہ کرے اور اپنے مالک وخالق کی بارگاہ میں اپنی صحت وتندرستی کی دعا کرتا رہے بدکاریوں سے باز رہے اور ان افعال پر قائم رہے جن میں اس کا فائدہ بھی ہو اور خوشنودیٔ رب بھی۔ اگر کوئی بادشاہ اپنی رعایا کو ہزاروں اور لاکھوں اشرفیاں اور روپے تقسیم کر دے تو کیا اس بادشاہ کی عظمت عوام الناس کے دلوں میں نہ پیدا ہوگی اور کیا اس سے اس کی سخاوت کا شہرہ نہ ہو جائے گا؟ حالانکہ اس بات کو اس بارش جیسی نعمت سے کیا نسبت ہے، جو آبادیوں، شہروں اور ملکوں نیز تمام روئے زمین اور باشندوں کو سیر و سیراب کرتی ہے، کہیں زیادہ ہے ان لاکھوں کروڑوں اشرفیوں اور روپوں سے۔

تم ذرا غور کرو! کہ اس تھوڑی سی بارش کی کس قدر بڑی عظمت ہے لوگوں کے لیے اور کتنی بڑی نعمت ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اس سے غافل ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی چھوٹی سی ضرورت (بارش ہونے یا دیر تک نہ ہونے سے) رُک جاتی ہے تو ملامت کرنے لگتا ہے اور ناراض ہوتا ہے اس ذلیل وکمتر سی بات کو ترجیح دیتا ہے لیکن کبھی اس بڑی منفعت پر غور نہیں کرتا جو نہایت ہی قابل قدر ہے اور جس کا انجام بہت اچھا ہے۔

یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ اسے اس عظیم القدر نعمت اور اس کے فائدوں کی پوری معرفت نہیں ہے۔

بارش کے بلندی سے زمین پر برسنے اور اس کی مصلحت پر غور کرو! صرف اس لیے

بلندی سے برسائی جاتی ہے کہ اونچی اور سخت زمینوں پر بھی پڑے اور انہیں اچھی طرح سیراب کر سکے، اور اگر ایسا ہوتا کہ کسی ایک گوشے سے پانی آیا کرتا، تو ان مقامات پر نہ پہنچ سکتا جو بلند ہیں اور وہاں زراعت وغیرہ نہ ہو سکتی۔ دیکھو! کہ وہ زمین جس میں پانی سینچ کر زراعت کی جاتی ہے، بہت کم ہے (اور اگر ہے بھی تو اس کی آبپاشی میں صرف کثیر پڑتا ہے جس سے کاشتکاروں کو بہت کم نفع اپنی زراعت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا، ایسا مقرر کیا گیا کہ بارش بلندی سے برسا کرے تاکہ ہر بلند و پست مقام پر پانی پہنچ جائے)۔

لہٰذا بارش ہی ایسی چیز ہے کہ تمام زمین پر محیط ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ان وسیع صحراؤں اور پہاڑوں کے دامنوں میں بھی زراعت کر لی جاتی ہے تو بہت سا غلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

انہیں بارشوں کے سبب سے آدمیوں کی وہ مشقت بھی جاتی رہتی ہے جو ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر پانی لانے، لے جانے میں ہوتی ہے اور جو جو تنازعات اور جھگڑے فسادات اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی واقع ہوتے ہیں کہ ایک غلبے اور قوت والا آدمی تو پانی سے فائدہ حاصل کر لیتا ہے لیکن دوسرا کمزور اور ناتوان آدمی اس سے محروم رہتا ہے، وہ رفع ہو جاتا ہے۔

پھر چونکہ (بارش کے پانی کے لیے) یہ مقدر کیا گیا تھا کہ اوپر سے زمین پر برسے، لہٰذا ایسا بنایا گیا کہ چھڑکاؤ کے طور پر زمین پر پڑے تاکہ زمین کے اندر جذب ہو کر اسے سیراب کر سکے۔ اور اگر زور سے بہتا ہوا آتا اور زمین پر سیل کی طرح گرتا تو اس میں جذب نہ ہوتا۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتا، لہٰذا ایسا مقرر ہوا کہ آہستہ آہستہ قطروں کی صورت میں برسا کرے تاکہ بوئے ہوئے دانے خراب نہ ہوں، زمین سیراب ہو اور زمین

اور کھڑی ہوئی زراعتیں اس سے زندہ ہوتی رہیں۔

اس طرح برسنے میں اور بھی مصلحتیں ہیں؛

۱۔ یہ کہ بدنوں میں نرمی اور لینت پیدا کرتا ہے۔

۲۔ یہ کہ ہوا کدورت کو صاف و شفاف کرتا ہے جس سے وبا و امراض دفع ہوتے ہیں۔ جو ہوا کی خرابی سے پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ درخت اور زراعتوں میں جو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور بیماریاں جیسے یرقان وغیرہ انہیں دفع کر دیتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی فوائد ہیں۔

پس اگر کوئی معترض یہ کہے کہ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اس بارش کے سبب سے کسی سال بہت سخت نقصان بھی پہنچتا ہے جبکہ یہ شدت سے برستا ہے یا اولے (یعنی برف) پڑتے ہیں جن سے فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، اور ہوا میں بخارات پیدا کر دیتا ہے جس سے بدنوں میں بہت سے امراض و آفات حادث ہوتے ہیں، تو اس سے کہا جائے گا کہ:

ہاں یہ زیادتی بھی کبھی انسان ہی کی اصلاح اور اس کی معصیتوں میں پڑے رہنے سے روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ فائدہ جو اس کے دین کی اصلاح کے لیے ہوگا وہ یقیناً اس نقصان سے بہتر ہوگا جو اس کے مال میں واقع ہوتا ہے۔ (یعنی اگرچہ زیادتی بارش سے انسان کے مال کا نقصان ہوگیا، اس کو بدنی تکلیف پہنچی لیکن متنبہ تو ہوا کہ ہمارا کوئی زبردست خالق بھی ہے جو ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس سے ڈرتا رہے تاکہ اس کے دین کی اصلاح ہو جائے جس کا فائدہ ابدی اور غیر منقطع ہے۔

پہاڑوں کی حکمت

مفضل! ان پہاڑوں کو دیکھو! جو مٹی اور پتھر سے جما جما کر بنائے گئے ہیں جنہیں

غافل لوگ بیکار و بلا ضرورت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہت کچھ فوائد پہنچتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ:

۱۔ ان پر برف پڑتی ہے اور وہ ان کی چوٹیوں پر باقی رہتی ہے جسے ضرورت ہو وہ اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور جو برف پگھل جاتی ہے اس سے کثیر تعداد میں پانی کے چشمے بہتے ہیں جن سے بڑی بڑی نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔

۲۔ ان پر ایسی ایسی جڑی بوٹیاں اور نباتات اُگتے ہیں جو ہموار اور نشیبی زمینوں میں نہیں ہوتے۔

۳۔ ان میں وحشی و ضرر رساں درندوں کے لیے غار اور درّے ہیں۔

۴۔ دشمنوں سے بچنے کے لیے ان میں بلند قلعے بھی بنا لیے جاتے ہیں۔

۵۔ انہیں تراش کر مکان بناتے اور چکیوں وغیرہ میں صرف کرتے ہیں۔

۶۔ ان میں قسم قسم کے جواہرات کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں جنہیں وہی جانتا ہے جس نے اپنے علم قدیم سابق کے ذریعے سے ان کو باندازہ معین ونصب کر دیا ہے۔

معدنیات کا بیان

مفضل! ان معدنوں کو، جو ان سے مختلف قسم کے جواہر نکلتے ہیں، ان پر غور و فکر کرو! مثلاً گچ، چونا، جبسم (ایک قسم کا چونا ہے جو گچ کے کام آتا ہے)۔ ہڑتال مردار سنگ، پارہ، تانبا، رانگہ (رانگا)، چاندی، سونا، زبرجد، یاقوت، زمرد اور انواع و اقسام کے پتھر اور علیٰ ہذا القیاس، ان سے تارکول، مومیائی، گندھک، نفت (ایک قسم کا مٹی کا تیل ہے۔) نمک وغیرہ نکلتے ہیں جنہیں لوگ اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔

کیا یہ بات کسی عقلمند سے پوشیدہ ہے کہ یہ تمام ذخیرہ آدمیوں ہی کے لیے جمع کیا گیا

ہے جسے وہ نکال نکال کر اپنی ضروریات کے وقت استعمال کرتا ہے؟

پھر یہ بھی کہ آدمیوں نے جو یہ حرص کیا کہ ہم سونا چاندی بنالیں اور اس میں کوشش صرف کی، ان کو کچھ بن نہ آئی اور تدبیر ان کی قاصر رہی۔ ورنہ اگر یہ لوگ جیسا چاہتے تھے پا جاتے اور اس کا علم ان کو حاصل ہو جاتا تو لامحالہ یہ علم ظاہر ہو جاتا اور ہر چار طرف پھیل جاتا، پھر تو چاندی سونا اس کثرت سے بننے لگتا کہ لوگوں کے نزدیک اس کی قدر و قیمت ہی نہ باقی رہتی اور جو فائدہ خرید و فروخت اور معاملات میں اس سے پہنچتا ہے وہ فوت ہو جاتا۔ نہ بادشاہ کے پاس مال ہی آتا اور نہ کوئی اپنی اولاد کے واسطے ذخیرہ ہی کرتا۔

بایں ہمہ یہ بھی ہوا کہ آدمیوں کو تانبے (اور جست کو ملا کر) پیتل، ریت سے شیشہ، رانگے سے چاندی اور چاندی سے سونا وغیرہ بنانے کی تدبیر و ترکیب بتا دی گئی ہے جن میں کچھ مضرت نہیں ہے (کیونکہ ایسے جاننے والے اور کرنے والے کم ہیں جن کی وجہ سے ضرر عام نہیں ہے اور نہ اس سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر عام طور پر ہر شخص سونا، چاندی بنا لیا کرتا، تو اولاً یہ ایک بے قدر چیز ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ معاملات وغیرہ میں اس سے مدد نہ لی جاتی، تیسرے یہ کہ کوئی اس کو ذخیرہ نہ کرتا۔ کیونکہ ہر شخص اس کا بنانا جانتا۔ کیا ایسی عزیز چیز ہے جس کو ذخیرہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ نقصانات لوگوں کو پہنچتے)

دیکھو کہ جس میں کچھ نقصان نہ تھا وہ تو ان کو بتا دیا گیا ہے اور جو نقصان رساں تھا (عام طور پر ہر شخص کا کیمیا گر ہو جانا) وہ انہیں نہ بتایا گیا۔

اگر کوئی شخص کسی کان میں داخل ہو تو اسے ایسی بڑی بڑی ندیاں دکھائی دیں گی جن میں برابر کثرت سے پانی بہہ رہا ہے نہ ان کی تہہ معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ان کے عبور کرنے کی کوئی تدبیر ہے اور اس کے بعد اسے چاندی کے پہاڑ ہی پہاڑ سے کھڑے ہوئے ملیں گے۔

غور کرو کہ اس میں خالق حکیم کی کیا حکمت و تدبیر ہے۔ اس نے یہ چاہا ہے کہ

بندوں کو اپنی قدرت اور اپنے خزانوں کی وسعت دکھا دے تا کہ وہ جان لیں کہ اگر پروردگار چاہے کہ ہمیں پہاڑوں کے بقدر چاندی عطا کر دے تو کر سکتا ہے لیکن اس میں ان کے لیے کچھ بہبودی نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس میں وہی خرابی واقع ہوتی جو ہم نے بیان کی ہے کہ ان جواہرات کی قدر لوگوں کی نگاہوں میں نہ رہتی اور ان سے بہت کم فائدہ اٹھاتے۔

اسے اس طرح سمجھو کہ کوئی نئی چیز جسے آدمی ایجاد کرتا ہے۔ مثلاً ظروف یا دوسرے اسباب جب تک کہ وہ نئی چیز کمیاب و نادر الوجود رہتی ہے تب ہی تک نفیس وگرانقدر اور گراں قیمت ہوتی ہے اور جب عام ہو کر لوگوں کے ہاتھ آ جاتی ہے تو بے قدر ہو کر کم قیمت ہو جاتی ہے۔ ہر چیز اس وقت تک نفیس سمجھی جاتی ہے جب تک کمیاب ہو۔

نباتات کا بیان

مفضل! ان نباتات اور ان کی انواع و اقسام کی ضرورتوں پر غور کرو۔ پھل تو غذا کے کام آتے ہیں۔ خشک گھاس جانوروں کی خوراک ہے۔ لکڑی جلانے اور نجاری (بڑھئی) وغیرہ کے کام آتی ہے۔ چھال، پتیاں، موٹی اور پتلی جڑیں اور گوند طرح طرح کے فائدوں کے لیے ہیں۔

دیکھو! اگر یہ پھل جنہیں ہم اپنی غذا میں صرف کرتے ہیں، ایک ہی جگہ کہیں زمین پر مل جاتے اور ان شاخوں میں نہ لگتے جو ان کی حامل ہوتی ہیں، تو ہماری زندگی کے امور میں کس قدر خلل واقع ہوتا۔ اگرچہ غذا تو بہم پہنچ جاتی مگر لکڑی کے تختے وغیرہ، خشک گھاس اور تمام ان چیزوں میں بھی جنہیں ہم نے بیان کیا ہے بہت بڑے بڑے فائدے ہیں اور نہایت قابل قدر و وقعت ہیں (وہ کہاں سے ہاتھ آتے، اگر پھل، بغیر درخت کے کسی ایک جگہ زمین پر رکھے ہوئے مل جایا کرتے۔)

علاوہ بریں، نباتات میں اس کے حسن منظر اور شادابی سے وہ لذت و فرحت

حاصل ہے جس کے برابر تمام جہان میں مناظر اور حسن نظر جیسی کوئی چیز نہیں (درختوں کی سبزی دیکھ کر آنکھوں میں خنکی پیدا ہوتی ہے دل کو فرحت ہوتی ہے، طبیعت کی پژمردگی رفع ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔)

مفضل! اس افزائش کو خیال کرو جو زراعت میں قائم کی گئی ہے کہ ایک دانے سے سو دانے اور کچھ کم و بیش بھی پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ (عقلاً) تجویز یہ کیا جاتا ہے کہ ایک دانے سے ایک ہی دانہ پیدا ہو سکے گا۔ تو پھر کیوں اس قدر افزائش ہو جاتی ہے، اسی لیے تاکہ غلے میں وسعت ہو جائے کہ بیج ڈالنے کے بھی کام آئے جو کاشتکاروں کے لیے آئندہ فصل کی خوراک کا بھی سامان رہے۔

دیکھو! جب کوئی بادشاہ کسی شہر کو آباد کرنا چاہتا ہے تو وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کو اس قدر غلہ دیا جائے کہ جس سے بیج بھی بویا جا سکے اور زراعت کے تیار ہو جانے تک غذا میں بھی استعمال کیا جا سکے۔

دیکھو! یہ مثال کس طرح حکیم مطلق (یعنی باری تعالیٰ عزاسمہٗ) کی تدبیر میں پہلے ہی گزری ہے کہ زراعت میں اس قدر افزائش ہونی چاہیے، تاکہ غذا اور کاشت دونوں کی ضرورتوں کے لیے کافی ہو سکے۔

علیٰ ہذا القیاس، درخت، نباتات اور نخل خرما کا حال ہے کہ کثرت سے ان میں پھل لگتے ہیں۔ تم دیکھتے ہو گے کہ جڑ تو ایک ہی ہے مگر اس کے چاروں طرف کتنے اس کے بچے (شاخیں) ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟

اسی لیے، تاکہ لوگ اسے توڑ کر اپنی ضروریات میں استعمال کریں، اور دوبارہ اس کا بیج زمین میں بویا جا سکے۔ اگر ایک ہی جڑ رہ جاتی، اس میں شاخیں نہ پھوٹتیں اور یہ افزائش نہ ہوتی تو بالکل ممکن نہ ہوتا کہ کسی کام یا بونے کے لیے اس میں سے کوئی چیز توڑی جائے۔ پھر

اگر نا گہانی بلا آ جاتی تو اصل ہی فنا ہو جاتی اور اس کے قائم مقام دوسرا درخت نہ ہو سکتا۔

(لہٰذا ایسا مقرر کیا گیا کہ ان کے بیج یا شاخیں آئندہ ایسے ہی درخت پیدا کرنے کے کام میں آتی رہیں۔ ان میں یہ طاقت دی گئی ہے کہ ویسے ہی درخت اگائیں تاکہ اخراج مثل کا قاعدہ جاری رہے اور درختوں کی نسل قطع نہ ہو۔)

مفضل! مسور، ماش، باقلا وغیرہ دالوں کے پیدا ہونے پر بھی خیال کرو، کہ یہ تمام دالیں ایک ایسی چیز کے اندر پیدا ہوتی ہیں جو مثل پھلی کے ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کو سخت اور مستحکم ہونے تک آفتوں سے حفاظت کرے جیسا کہ مشیمہ (جھلی جس میں بچہ ماں کے شکم میں لپٹا ہوا ہوتا ہے) جنین کے اوپر اسی غرض سے لپٹا ہوا ہوتا ہے کہ اسے ہر قسم کے صدمے سے محفوظ رکھے) لیکن گیہوں اور اس کے مشابہ جو دانے ہیں وہ تہہ بہ تہہ ان سخت چھلکوں کے اندر ہوتے ہیں جن کے سروں پر بالیوں کی نوکیں برچھی کی طرح تیز نکلی ہوتی ہیں تاکہ پرندوں وغیرہ کو اس سے باز رکھیں اور کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ دانے حاصل ہو سکیں۔ اگر یہ تیز نوکیں ان پر نہ ہوتیں تو پرندے بالیاں توڑ لیا کرتے اور کاشتکار بیچارے دیکھتے رہ جاتے)۔

اگر کوئی معترض کہے کہ پرندے گیہوں وغیرہ کے دانوں کو کیا نہیں پا سکتے؟ تو اس کو جواب دیا جائے گا، کہ ہاں! پا تو سکتے ہیں اور یہی ان کے لیے مقدر و معین بھی کیا گیا ہے۔

کیونکہ پرندے بھی خدائے تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور ان کے لیے بھی پروردگار عالم نے زمین کی پیداوار میں سے ایک حصہ قرار دیا ہے لیکن یہ دانے ان پردوں میں اس لیے محفوظ کیے گئے ہیں کہ پرندے ان پر پورا قبضہ نہ پا سکیں، جس سے ان کو خواہ مخواہ توڑ کر خراب کریں اور زیادہ نقصان کر دیں۔ کیونکہ اگر یہ پرندے دانوں کو کھلا ہوا پاتے اور ان کو پر کوئی محافظ نہ دیکھتے تو دانوں پر ٹوٹ پڑتے اور تباہ و برباد کر ڈالتے، جس سے

یہ خرابی بھی لاحق ہو جاتی کہ پرندوں کو بدہضمی ہو جاتی اور وہ مر جاتے۔

دوسرے یہ کہ کاشتکار بیچارے اپنے کھیتوں سے خالی ہاتھ واپس آتے...... لہذا یہ حفاظتیں ان دانوں پر قائم کی گئیں، تا کہ انہیں بچائے رکھیں۔ اب اگر پرندے اس سے پاتے بھی ہیں تو حسب ضرورت، جس سے اپنی مقررہ قوت حاصل کر سکیں اور انسانوں کے لیے بھی بچ رہے کیونکہ وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اس لیے کہ انہیں کی کوششوں سے سب پیداوار لہلہاتی ہے۔

درختوں اور قسم قسم کے نباتات کی پیدائش کی حکمت پر غور کرو۔ چونکہ ان کو مثل حیوانات کے غذا کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ مگر حیوانوں کی طرح ان کے نہ منہ ہیں نہ قوت ارادہ وحرکت، جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرنے کی سعی کر سکیں۔

لہذا ان کی جڑیں زمین میں مضبوط قائم کی گئیں تا کہ ان کے ذریعے سے اپنی غذا لے کر شاخوں اور پتیوں اور پھلوں تک پہنچائیں۔ زمین ان کے لیے مثل ماں کے ہے اور جڑیں بجائے منہ کے ہیں جن سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں جیسے حیوانات کے بچے اپنی ماؤں کے پستانوں کو منہ میں لے کر دودھ پیتے ہیں۔

تم دیکھتے نہیں کہ، خیموں اور چھولداریوں کی عمودیں کس طرح سے طنابوں سے باندھ کر ہر طرف سے کھینچ دی جاتی ہیں تا کہ خیمے سیدھے کھڑے رہیں۔

علیٰ ہذا القیاس، تم ہر ایک نبات کو بھی ایسا ہی پاؤ گے کہ ان کی جڑیں زمین کے اندر ہر طرف پھیلی رہتی ہیں تا کہ درختوں کو پکڑے رہیں اور قائم رکھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنے بڑے بڑے کھجور وغیرہ کے درخت آندھیوں میں کیسے کھڑے رہ سکتے تھے۔

دیکھو! کہ خلاق دو عالم کی حکمت وصناعت (خیمہ بنانے) کی حکمت سے کیوں کر سابق ہو گئی۔ وہ تدبیر جیسے کاریگر خیموں اور چھولداریوں کے قائم رکھنے میں صرف کرتے

ہیں یعنی درختوں کی حکمت پر انسانوں نے اپنی ضروریات زندگی اوّلین چیز کو منحصر کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ صنعت اس خلقت سے عبارت ہے جس پر اشجار کو قائم کیا گیا ہے۔

مفضل! پتوں کی پیدائش کو غور سے دیکھو! تمہیں ان کے اندر جڑوں کی طرح رگیں پھیلی ہوئی معلوم ہوں گی جو پتوں کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور بعض باریک ہوں گی جو ان موٹی رگوں کے درمیان سے گزرتی ہیں نہایت ہی مضبوط و باریک بنی ہوئی ہیں۔ جن کو اگر کوئی انسان بنانا چاہے تو ہرگز ان جیسی نہیں بنا سکتا۔ علاوہ اس کے آلات، حرکت، تدبیر اور کلام کی ضرورت ہوتی۔ (ایک دوسرے سے مشورہ کرتے کہ کس طرح بنائی جائیں وغیرہ)۔

یہاں دیکھو تو فصل بہار کے چند ہی دنوں میں اس قدر پتیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ تمام پہاڑ اور نشیبی مقامات اور زمین کے تمام قطعات بلاحرکت اور بغیر بولے چالے (بغیر کلام کیے) صرف ایک ارادے کے ذریعے سے جو تمام چیزوں میں نافذ ہے اور صرف ایک حکم لازم الاطاعت سے بھر جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ان باریک رگوں کی علت و سبب کو بھی معلوم کر لو۔ یہ اس لیے ان پتیوں کے اندر داخل کی گئی ہیں کہ اسے سیراب رکھیں اور پانی کو ان تک پہنچائیں، جیسے جسم کے اندر کی رگیں صرف اس لیے پھیلی ہوئی ہیں تاکہ ہر جزو کو غذا پہنچاتی رہیں۔

پتیوں کی موٹی رگوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی صلابت اور مضبوطی کے ذریعے سے پتیوں کو مضبوط پکڑے رہتی ہیں تاکہ پھٹ نہ جائیں دیکھو! یہ پتیاں ان مصنوعی پتیوں سے بہت مشابہ ہیں جو کپڑوں کے پارچوں وغیرہ سے (تراش) کر بنائی جاتی ہیں اور جن میں طول و عرض لمبی لمبی سینکیں لگائی جاتی ہیں تاکہ اس کو پکڑے رہیں اور وہ ہلنے جلنے نہ پائیں۔

پس صناعت (ہاتھ سے پتیوں کا بنانا) خِلقت (خدائی ساخت) کی ایک نقل ہے اگر چہ اس کی پوری حقیقت تک پہنچنا محال ہے (لوگوں نے کپڑے اور کاغذ وغیرہ کے کیسے کیسے گل بوٹے جھاڑ، بیل درخت بنائے مگر ''چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک'' مصنوعی چیز حقیقت سے بہت دور ہوتی ہے۔ اوّل تو نقل ہی پورے طور پر مشابہ اصل کے نہیں ہوتی۔ دوسرے فطری قوی نہیں آسکتے جن سے اصلی درختوں کی حیات ہے)۔

اس گٹھلی اور بیج کی علت کو خیال کرو، کہ یہ پھل کے اندرونی حصے میں قرار دی گئی ہے تاکہ اگر کوئی چیز اصل درخت کو فنا کردے تو یہ اس کے قائم مقام ہو سکے جیسے کوئی نہایت ہی نفیس چیز جس کی ضرورت بہت پڑتی ہو کئی کئی مقاموں پر رکھ دی جاتی ہے تاکہ اگر کوئی حادثہ ایک مقام رونما ہو جائے تو وہ شے دوسرے مقام پر دستیاب ہو سکے (اسی طرح یہ گٹھلیاں اور بیج ہزاروں پھلوں کے اندر پیدا کر دیے گئے تاکہ وقت ضرورت کام آسکیں)۔

پھر یہ بھی ہے کہ اپنی صلابت اور سختی سے پھلوں کی نرمی و رقت کو نہیں روکتے۔ اگر یہ بیج اس کے اندر نہ ہوتے تو یہ پھل پھٹ جاتے اور ان میں جلد ہی خرابی پیدا ہو جاتی۔

بعض بیج اور گٹھلیاں ایسی بھی ہیں کہ کھائی جاتی ہیں اور ان سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جو مختلف مصلحتوں میں کام آتا ہے اور جب تم کو گٹھلی اور بیج کی ضرورت اور غرض معلوم ہو گئی تو اس پر غور کرو کہ چھوارے کی گٹھلی کے اوپر مغز خرما اور انگور کے بیج کے اوپر مغز انگور کیا چیز ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے اور اس شکل پر کیوں نکلتا ہے؟ حالانکہ ممکن تھا کہ اس کے قائم مقام وہ شے پیدا ہوتی جو کھانے میں استعمال نہ ہوتی جیسے سرو اور چنار وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اسی لیے تو لذیذ کھانے کی چیزیں اس کے اوپر پیدا ہوتی ہیں کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے۔

درختوں میں جو اور کئی قسم کی حکمتیں رکھی گئی ہیں ان پر غور کرو۔

تم انہیں دیکھو گے کہ ہر سال ان پر ایک مرتبہ خزاں آتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ان

کی حرارت غریزہ شاخوں میں جمع ہو جاتی ہے اور اس کے اندر پھلوں کے مادے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان پر بہار آتی ہے اور پتیاں نکل آتی ہیں اور تمہیں طرح طرح کے پھل اور میوے دیتے ہیں۔ جیسے تم کبھی اپنے سامنے قسم قسم کے کھانے رکھتے ہو جنہیں اپنے ہاتھ سے باری باری پکایا ہو (اسی طرح یہ مختلف قسم کے پھل ہیں)۔ تو دیکھو کہ شاخیں اپنے اپنے پھل لے کر تمہارے سامنے آتی ہیں گویا وہ تمہیں ان پھلوں کو اپنے اپنے ہاتھ سے دے رہی ہیں۔

اور تم پھولوں کو دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے اپنی شاخوں پر آتے ہیں گویا وہ خود اپنے تئیں تمہارے روبرو پیش کرتے ہیں۔ یہ کس کا اندازہ قائم کیا ہوا ہے کس نے ایسا بنایا ہے؟ اسی نے جو مقتدر و حکیم ہے اور غرض کیا ہے؟ یہی کہ آدمی ان پھلوں اور پھولوں میں تفکر کرے۔ تعجب ہے ایسے آدمیوں سے کہ بجائے نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کے خود منعم حقیقی ہی کا انکار کرتے ہیں۔

اس انار پر غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کیا عمدہ تدبیر و حکمت ہے؟ تم اس کے اندر یہ دیکھتے ہو، کہ چاروں طرف جمی ہوئی (زرد، زرد دیواریں ہیں جو مثل پردے کے ہیں۔) جھلیاں اور تہہ بہ تہہ دانے چنے ہوئے کھڑے ہوئے معلوم ہوں جیسے کسی نے اپنے ہاتھ سے چُن دیا ہے اور تم دانوں کو دیکھو گے کہ ہر ایک کئی حصوں پر منقسم ہے۔ اس کا ہر حصہ ایک بنے ہوئے پردے میں لپٹا ہوا ہے جو نہایت ہی عجیب و لطیف طور پر بنایا گیا ہے اور اوپر کا چھلکا ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اس صناعی میں حکمت یہ رکھی گئی ہے کہ انار کا مغز صرف دانہ ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ صرف دانے ایک دوسرے کو بڑھا نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا یہ جھلی اس کے اندر قائم کی گئی کہ اس کو غذا پہنچایا کرے۔ تم دیکھتے نہیں کہ ان دانوں کی جڑیں اس جھلی میں کس طرح جڑی ہوئی ہیں، پھر ان پر یہ پردے اس لیے قائم کیے گئے، کہ ان کو سمیٹے اور پکڑے رہیں۔ متحرک نہ

ہونے پائیں اور ان سب کے اوپر ایک مستحکم چھلکا اوڑھا دیا گیا، تاکہ آفتوں سے ان کی حفاظت کرتا رہے۔

یہ تو انار کی بہت سی صفتوں میں سے تھوڑی سی صفات کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس میں اور بھی بہت سی صفات موجود ہیں جنہیں وہ شخص بیان کر سکتا ہے جسے طول کلام مقصود ہو لیکن، میں نے جس قدر تم سے بیان کر دیا ہے اتنا ہی دلیل اور عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

مفضل! اس کمزور یقطین (ہر بیلدار درخت جس میں تنا نہ ہو) کو دیکھو! کہ ایسے بڑے بڑے کدو، ککڑی، تربوز کا متحمل رہتا ہے اور اس میں کیا کیا حکمتیں اور تدبیریں ہیں ازبسکہ اس کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ ایسے بڑے بڑے پھل وغیرہ کا متحمل ہوگا تو اس کا درخت (بیل) بھی زمین پر پھیلا ہوا بنایا گیا۔ اور اگر سیدھا درخت ہوتا جیسے زراعت اور اشجار ہوتے ہیں تو یہ ان پھلوں کا متحمل نہ ہوسکتا، اور قبل پختہ ہونے اور ان کے حد تک پہنچنے ہی کے ٹوٹ پڑتا۔

لہٰذا، دیکھو کہ کس طرح زمین پر پھیلتا ہے تاکہ اس پر اپنے پھلوں کا بار رکھے اور اس کی طرف سے زمین ہی ان پھلوں کی متحمل رہے۔ تم دیکھتے ہو گے کہ کدو اور خربوزے کی جڑیں زمین پر بچھی ہوئی ہیں اور اس کے پھل زمین پر اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسے کوئی بلی ہے کہ لیٹی ہوئی ہے اور اس کے پھلوں میں اس کے بچے ہیں جو دودھ پی رہے ہیں۔ (یہی بعینہٖ مثال کدو کے بیل اور اس کے پھلوں کی ہے۔)

غور کرو کہ یہ تمام قسم کی بیلیں انہیں فصلوں میں پیدا ہوتی ہیں جو ان کے لیے مناسب ہے۔ مثلاً سخت گرمی اور حرارت کے اشتعال کے وقت تو کس طرح سے لوگ ان کو نہایت شوق اور خوشی کے ساتھ لیتے ہیں۔ اور اگر جاڑوں میں پیدا ہوا کرتے تو انسان کو ان سے نفرت ہوتی